یگانہ

احوال و آثار

نیّر مسعود

یگانہ
احوال و آثار

احوال و آثار

نیر مسعود

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی

Hasnain Sialvi

فہرست

حرف آغاز

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اردو میں یگانہ کے ساتھ بے انصافی ہوئی۔ انہیں وہ مقام نہیں ملا، جس کے وہ مستحق تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ صورت حال خود اُن کی پیدا کی ہوئی تھی۔ یگانہ اردو کے ممتاز شاعر تھے اُن کے طرزِ فکر اور لب و لہجے دونوں میں انفرادیت تھی۔ ہر فنکار بلکہ ہر انسان میں تھوڑی بہت انا ضرور ہوتی ہے۔ لیکن یگانہ کی انا اعتدال کی تمام حدود کو پار کر چکی تھی۔ کوئی بھی معقول اور سمجھدار انسان اپنے بارے میں وہ بات نہیں کہہ سکتا جو یگانہ کھلے عام کہا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ "سچ تو یہ ہے کہ اس صدی میں یگانہ کے سوا اور کسی کو شاعر سمجھنا محض خود فریبی ہے"۔ (آیاتِ وجدانی طبع سوم ص ۸۸) اس طرح کی تعلیوں نے یگانہ کی زندگی کو اجیرن بنا دیا تھا۔

زیر نظر کتاب اردو کے ممتاز محقق اور نقاد نیّر مسعود کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے یگانہ کی ممتاز شخصیت اور ادبی خدمات کے اہم پہلوؤں پر لکھے ہیں۔ نیّر صاحب نے اپنے والدِ محترم سید مسعود حسن رضوی ادیب کی طرح یگانہ کے فن کے قائل ہیں اور انہیں یگانہ کی ذات سے پوری ہمدردی ہے۔ انہوں نے بہت ہی معقول اور مدلل انداز میں یگانہ کی ذہنی کجروی اور ابنارمل شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے یگانہ کی شخصیت کے بارے میں جو کچھ لکھ دیا ہے، میں اُس میں سے چند اہم نکات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یگانہ ۱۹۰۵ء میں جب لکھنؤ آئے ہیں تو اُن کی عمر اکیس سال تھی۔ اُس وقت لکھنؤ میں صفی، ثاقب اور عزیز کا طوطی بول رہا تھا۔ یگانہ کو وہ اہمیت نہیں ملی، جو ان تینوں حضرات کو حاصل تھی۔ اپنے معاصرین سے مخاصمت کی بظاہر یہی وجہ ہے۔ ۱۹۱۴ء میں جب یگانہ نے

"نشترِ یاس" کے نام سے اپنا دیوان شائع کیا تو اس کے مقدمے میں تعلی سے کام لیتے ہوئے لکھا کہ لکھنؤ کے معاصرینِ حال اور آئندہ نسلوں پر فرض ہے کہ یگانہ کی زبان اور اجتہادی تصرفات سے سند لیں۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے ثاقب، عزیز اور دوسرے معاصرین سے مطالبہ کیا کہ وہ انہیں استادِ فن تسلیم کر کے اُن کی پیروی کریں۔

۱۹۲۰ء تک پہنچتے پہنچتے یگانہ اور لکھنؤ کے شاعروں کے درمیان ادبی معرکے عروج پر پہنچ گئے۔ اسی سال عظیم آباد کے ایک مشاعرے میں ایک مقطع پڑھا۔

جان سے بڑھ کر سمجھتے ہیں مجھے یاس اہلِ دل
آبروئے لکھنؤ، خاکِ عظیم آباد ہوں

اس شعر سے یگانہ کے مخالف بھی بھڑک گئے۔ اپنے معاصرین کے علاوہ یگانہ، غالب کے بھی مخالف تھے۔ اور اس کی وجہ بظاہر وہی ہے، جو نیر مسعود صاحب نے بیان کی ہے۔ صفی، عزیز اور ثاقب غالب کے ممدوح تھے اور ان کی پیروی کی کوشش کرتے تھے۔ ان تینوں کی ضد میں یگانہ نے غالب کے خلاف ایسی رباعیاں کہیں جن میں غالب کے متعلق بہت نازیبا اور ناشائستہ باتیں تھیں۔ یہ جنوں اور پاگل پن اس حد تک بڑھ گیا کہ انہوں نے کچھ ایسی رباعیاں کہیں، جن میں آنحضرت کی شان میں گستاخی کی گئی تھی۔ اہلِ لکھنؤ نے اُن رباعیوں سے مشتعل ہو کر ۳۱ مارچ ۱۹۵۳ء کو یگانہ کا منہ کالا کر کے انہیں گدھے پر بٹھا کر شہر میں جلوس نکالا۔ یگانہ نے آنحضرت کی شان میں جو گستاخی کی وہ کوئی مجنوں، ابنارمل اور ذہنی مریض ہی کر سکتا ہے۔ اور ایک ذہنی مریض کے ساتھ یہ رویہ ذہنی مریضوں کا ہی ہو سکتا ہے۔ بہرحال تاریخِ ادب اردو میں اس واقعہ کی شاید ہی کوئی اور مثال ملے۔

نیر مسعود صاحب نے بڑے سلیقے اور مستند حوالوں کے ساتھ تاریخِ ادب اردو کے یہ المناک ترین واقعات بیان کیے ہیں۔ یگانہ کے بارے میں ان کی معلومات، ان کے ہمدردانہ اور معتدل رویے کو دیکھتے ہوئے میری فرمائش ہے کہ وہ یگانہ کے مکمل سوانح لکھیں اور اُن کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ لیں۔

خلیق انجم

یگانہ (بہ حوالۂ ادیب)

۱۹۲۰ء میں لکھنؤ کے شاعروں اور میرزا یگانہ چنگیزی (اس وقت "یاس عظیم آبادی") کا معرکہ اپنے عروج پر تھا۔ اس سال عظیم آباد کے ایک مشاعرے میں یگانہ نے یہ مقطع پڑھا:

جان سے بڑھ کر سمجھتے ہیں مجھے یاس اہلِ دل
آبروئے لکھنؤ خاکِ عظیم آباد ہوں

مشاعرے سے واپس آکر انہوں نے یہ مقطع روزنامہ "ہمدم" لکھنؤ میں چھپوا دیا۔ عظیم آباد کی خاک کو لکھنؤ کی آبرو ٹھہرانا ظاہر ہے اہل لکھنؤ کو پسند نہیں آسکتا تھا، چنانچہ اس مقطع پر شہر کے شاعروں میں برہمی پیدا ہوئی۔ یگانہ نے مزید چھیڑنے کے لیے اس غزل میں اس شعر کا اضافہ کر دیا:

لکھنؤ کے فیض سے ہیں دو دو سہرے میرے سر
اک تو استادِ یگانہ دوسرے داماد ہوں[1]

اسی سال یگانہ نے عزیز لکھنوی کے خلاف کتاب "شہرتِ کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز" لکھی (جس کے چھپنے کی نوبت پانچ سال بعد ۱۹۲۵ء میں آئی)[2]

---

[1] "آیات وجدانی"، میرزا یگانہ چنگیزی طبع اول۔ کریمی پریس لاہور (حسب فرمائش شیخ مبارک علی تاجرِ کتب ۱۹۲۷ء) صفحہ ۲۱۵ (یگانہ کی سسرال لکھنؤ میں تھی)

[2] "شہرتِ کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز"، اصح المطابع، لکھنؤ ۱۹۲۵ء خاتمہ صفحہ ۹۵

سید مسعود حسن رضوی ادیب اس زمانے میں الہ آباد میں تھے اور اسی سنہ ۱۹۲۰ء میں ان کی پہلی کتاب "امتحانِ وفا" شائع ہوئی۔ یہ لارڈ ٹینیسن کے منظوم المیہ افسانے "اینک آرڈن" کا اردو نثر میں ترجمہ ہے جو بائیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس میں کہیں کہیں حسب موقع شعر بھی درج ہوئے ہیں۔ کتاب کا آخری باب صرف یہ ایک شعر ہے :

نیرنگ حسن و عشق کی وہ آخری بہار
تربت تھی میری اور کوئی اشک بار تھا[1]

یہ شعر یگانہ کا ہے۔

اس وقت تک ادیب کو شہرت حاصل نہیں تھی لیکن لکھنؤ کے مشاہیر ادب میں مولوی بیخود موہانی اور یگانہ سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے :

"میری ملاقات مولوی محمد احمد بیخود موہانی سے ۱۹۱۵ء یا ۱۹۱۶ء میں ہوئی جب میں کیننگ کالج کا طالب علم تھا"[2]

یگانہ کی طرح بیخود کے تعلقات لکھنؤ کے بیشتر ممتاز شاعروں سے کشیدہ تھے اور اس زمانے میں یگانہ کو بیخود کی حمایت اور پشت پناہی حاصل تھی۔ بیخود کے وسیلے سے ادیب اور یگانہ کے مراسم کا آغاز ہوا (اسی زمانے میں ادیب اور مرزا ہادی رسوا نے بیخود کے کچھ اشعار کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا[3]) لکھنؤ کے جن شاعروں (صفی، ثاقب، عزیز، محشر وغیرہ) سے بیخود اور یگانہ کی آویزش تھی ان کی انجمن معیارِ ادب کا اس زمانے میں بڑا زور تھا۔ ظاہراً اسی انجمن کے مقابلے پر بیخود اور یگانہ نے "انجمن خاصانِ ادب" قائم کی۔ بیخود نے ادیب کو بھی (جو ۱۹۱۸ء میں الہ آباد جا چکے تھے) اس انجمن کا رکن بنایا اور اس کے دستور العمل کی تیاری میں ان سے تعاون طلب کیا۔ اس سلسلے میں ادیب کے نام اُن کے دو خطوں کے اقتباسات حسب ذیل ہیں :

---

[1] "امتحانِ وفا" یونانی دواخانہ پریس، الہ آباد ص ۵
[2] "خطوطِ بیخود" مرتبہ سید زائر حسین کاظمی۔ سرفراز پریس لکھنؤ (ناشر: مرتب) ۱۹۷۷ء ص ۲۳
[3] "خطوطِ بیخود" ص ۴۸، ص ۴۹

"انجمن خاصانِ ادب کی مختصر روداد یہ ہے کہ میری، یاس اور امید وغیرہ کی رائے سے ایک انجمن قائم کی گئی جس کی مختصر روداد اور نامکمل دستور العمل ہمدم، پیسہ اخبار، اودھ اخبار میں شائع ہوا۔

...... اس انجمن کا صدر جب تک کوئی بڑا اچھا اور بہی خواہ شخص نہ ملے، بیخودِ ناشاد ہے اور سکریٹری مرزا یاس عظیم آبادی ہیں دستور العمل کی نقل چھپ جانے پر ابلاغِ خدمت ہوگی۔ آپ کا نام محض اپنے وثوق پر میں نے آپ سے پوچھے بغیر داخل کر دیا ہے۔ اس انجمن نے اب تک تین ماہانہ مشاعروں کے سوا کچھ نہیں کیا...... مختصراً اس کے مقاصد یہ ہیں: قابل مگر گمنام شاعروں اور اہل قلم کو روشناسِ خلق کرانا، مجلس تنقید قائم کرنا جس میں وہ منتخب افراد ہوں گے جو انجمن کو میسر آسکیں، اردو، فارسی، عربی غزل (کذا) کے تصانیف پر تبصرہ و تنقید لکھنا، سررشتۂ تعلیم کی کتابوں کے متعلق اظہار رائے کرنا، تصنیف و تالیف و ترجمہ سے اردو کی خدمت، ماہانہ رسالے کا اجرا وغیرہ وغیرہ...... انجمن خاصانِ ادب کے دفتر کا پتا: لکھنؤ، قاضی کا باغ۔ مرزا واجد حسین صاحب یاس عظیم آبادی، سکریٹری، انجمنِ خاصانِ ادب"۔ (مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۱۹ء) [۱]

"مسودۂ دستور العملِ انجمن خاصان ادب ابلاغ خدمت ہے۔ ابھی اس میں ہر طرح کی ترمیم و تنسیخ و اضافہ کی گنجائش ہے۔ اس پر نظر فرما کر جلد واپس فرمائیں تاکہ اشاعت میں دیر نہ ہو"۔ (مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء) [۲]

○

۱۹۲۲ء میں ادیب لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے پہلے لکچرر مقرر ہو گئے۔ اس جگہ کے لیے

۱؎ "خطوطِ بیخود"، ص ۴۸، ص ۴۹

۲؎ "خطوطِ بیخود" ص ۴۹

لکھنؤ کے کئی بزرگ ادیبوں اور شاعروں نے بھی درخواست دی تھی جن میں سے بعض کی عمریں سبک دوشی کی عمر کے قریب آ پہنچی تھیں۔ ادیبؔ کے تقرّر کے خلاف احتجاج بھی ہوا، کہ اکابرِ ادب کے ہوتے ہوئے ایک غیر معروف نوجوان کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس طرح بہت چھوٹے پیمانے پر ادیبؔ کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جلد ہی ان کو شہر کے ادبی اور تہذیبی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہو گئی۔ یگانہؔ جن شاعروں سے برسرِ پیکار تھے اُن سے بھی ادیبؔ کے بہت اچھے تعلقات ہو گئے، خصوصاً صفیؔ لکھنوی اور آرزوؔ لکھنوی اُن کے بڑے قدردانوں میں تھے اور ادیبؔ بھی ان دونوں اساتذہ کے بہت قائل تھے۔

یہ یگانہؔ کی سخت پریشان حالی کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ کے شاعروں نے اُن کا بائیکاٹ کر رکھا تھا، اودھ اخبار میں ان کی ملازمت ختم ہو گئی تھی اور وہ اپنی کتابیں بیچ بیچ کر خرچ چلا رہے تھے۔[1] وہ خود لکھتے ہیں:

"جو واقعہ سب سے زیادہ جاں گسل ہے وہ یہ ہے کہ میری عمر کا سرمایہ یعنی کتب خانہ تنگ دستی کے ہاتھوں کوڑیوں کے مول لٹ گیا۔"[2]

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کے نام ۱۲ر دسمبر ۱۹۲۴ء کے خط میں لکھتے ہیں:

---

[1] علم عروض پر اپنی کتاب "چراغِ سخن" طبع ثانی (مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۲۱ء) کے مختلف صفحوں پر یگانہؔ نے مندرجۂ ذیل کتابوں کی فروخت کا اشتہار دیا ہے:

(۱) "سرِّ اکبر" از دارا شکوہ۔ عہد اورنگ زیب کا مخطوطہ بخط خلیفہ محمد شفیع (قیمت تیس روپے)۔ (۲) "مقیاس الاشعار" از مرزا اوج لکھنوی (قیمت دو روپے)۔ (۳) "دیوان ظہوری" مطبع نول کشور (قیمت دو روپے) (۴) "دیوانِ شوکت بخارائی" پرانا قلمی نسخہ (قیمت بیس روپے) (۵) "دیوانِ حکیم شفائی" قلمی (قیمت بیس روپے) کتابوں کی قیمتیں اس زمانے کو دیکھتے ہوئے کم نہیں ہیں۔ ظاہر اً جب یگانہؔ کی تنگ دستی بڑھی تو انہیں مجبوراً سستے داموں کتابیں بیچنا پڑیں (نیّر مسعود)

[2] "شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافات عزیز"، ص ۹۵

"تنگ دستی کے ہاتھوں مجھے اپنی عمر بھر کا سرمایہ یعنی کتب خانہ تک کوڑیوں کے مول بیچ کر سر بہ صحرا ہونا پڑا" ۳ھ

ادیب کو اسی زمانے سے پرانی کتابوں کی خریداری اور جمع آوری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ یگانہ کے اس سرمایے میں سے دو چیزیں اب بھی ذخیرۂ ادیب میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک میر غلام علی آزاد بلگرامی کا فارسی تذکرہ "مآثر الکرام موسوم بہ سروِ آزاد" ہے اور دوسری ماہنامہ "نظارہ" میرٹھ (مرتبہ محمد عبد الحمید حمید میرٹھی علیگ) کی فائل ہے۔ اس فائل پر ادیب کا مندرجہ ذیل نوٹ ہے:

ماہ نامہ "نظارہ" میرٹھ

جلد ۱ و ۲	جلد ۲ نمبر ۱ تا ۲	جلد ۳ نمبر ۱ تا ۶
نومبر و دسمبر ۱۹۱۵ء	جنوری تا جون ۱۹۱۶	جولائی تا دسمبر ۱۹۱۶ء

رسالہ نظارہ کے یہ چودہ شمارے مرزا واجد حسین یاسؔ کی ملک تھے جو بعد کو یگانہ چنگیزی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان رسالوں میں ان کے مضامین اور منظومات بھی شامل ہیں اور کئی جگہ ان کے دستخط موجود ہیں۔

ان دنوں میں ان کا قیام محلہ جھوائی ٹولہ لکھنؤ میں تھا

سید مسعود حسن رضوی

"مآثر الکرام" کے سرورق پر یگانہ کے ہاتھ کی مندرجہ ذیل تحریر ہے:

"مرزا واجد حسین یاسؔ عظیم آبادی۔ لکھنوی جھوائی ٹولہ $\frac{10}{16}$ /25"

جلد کی پوستین پر کی تحریر یہ ہے:

"مرزا واجد حسین یاسؔ لکھنؤ جھوائی ٹولہ ۳ نومبر ۱۹۱۶ء للعہ"

اسی ورق پر ایک تحریر یہ ہے:

"اشتریتہٗ عن الخواجہ المحمد عبد الرؤف المتخلص بہ عشرتؔ لکھنوی۔ الراقم العاصی فصیح الدولہ سید محمد نذیر حسن کمال عباشی الہاشمی السندیلوی غفرلہٗ۔ ۳۰ نومبر ۱۹۲۴ء"

۱ھ "نقوش" لاہور۔ مکاتیب نمبر حصہ دوم۔ نومبر ۱۹۵۷ء ص ۱۰۱

ان تحریروں کی روشنی میں یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب یگانہ نے ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو خریدی اور بندھنے کو دے دی۔ ۳ نومبر ۱۹۱۶ء کو یہ جلد بندی کے بعد انہیں واپس ملی۔ تنگ دستی کے عالم میں انہوں نے یہ کتاب لکھنؤ کے مشہور تاجر کتب خواجہ عبدالرؤف عشرت کے ہاتھ فروخت کی جن سے اسے کمال سندیلوی نے ۱۹۲۴ء میں خریدا۔ یہ معلوم نہیں کہ ادیب کو یہ کتاب اور "نظارہ" کی فائل کس ذریعے سے حاصل ہوئی۔

○

۱۹۲۸ء میں ادیب کی تصنیف "ہماری شاعری" منظرِ عام پر آئی اور ایک سال کے اندر اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ کتاب کے ساتھ ادیب کو بھی دیکھتے دیکھتے ہندوستان گیر شہرت حاصل ہو گئی اور اس میں مندرج اشعار زبانوں پر چڑھ گئے۔ اردو غزل کے دفاع اور اعلیٰ اردو شاعری کی مثالوں میں ادیب نے جو شعر درج کیے ان میں تڑپ کے نمونے کے طور پر یگانہ کا یہ شعر :

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا
نگاہِ شوق سے آگے تھا قافلہ دل کا

اور بلندیٔ خیال کی مثال میں ان کا یہ شعر پیش کیا :

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

اس شعر اور چکبست کے ایک شعر کے متعلق ایک صاحب نے ادیب کو خط لکھا[1] کہ ان کا مطلب واضح نہیں ہے اور فرمائش کی کہ ادیب ہی ان دونوں شعروں کی شرح کر دیں۔ ادیب نے ان دونوں شعروں کی مفصّل شرح لکھ کر رسالہ "نیرنگ" رام پور کے خاص نمبر (مارچ ۱۹۲۹ء) میں شائع کرادی[2]۔ یگانہ کے شعر کی شرح کرنے کے بعد انہوں نے لکھا :

---

[1] یہ خط ذخیرۂ ادیب میں موجود ہے۔ مکتوب نگار: اثیم علی کریم پر چیڑو، ڈاک خانہ ہرنوت، ضلع پٹنہ۔ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۲۸ء

[2] "ہماری شاعری" طبع دوم۔ نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۲۹ء دیباچہ ص ظ وضمیمہ ص ۱۹۳، ۱۹۴

"اب ذرا شعر کے اندازِ بیان پر نظر کیجئے۔ خوش نصیبی اور بد نصیبی کا معیار بنانا شاعر کا مقصود نہیں ہے۔ اس کے نزدیک تو مذکورہ معیار بالکل مسلّم ہے۔ اس لئے وہ اپنے بخت کی نارسائی پر پست خیال لوگوں کی طرح واویلا نہیں مچاتا بلکہ خوش ہوتا ہے اور فخر کے لہجے میں کہتا ہے کہ جس بد نصیب کو بخت نارسا نہیں ملا وہ خدا کو کیا جانے۔ وہ اپنے ارادوں کا بندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ خداشناسی اور خداپرستی کی اگر تلاش ہے تو مجھ سے خوش نصیبوں کو دیکھو جنہیں بختِ نارسا کی بدولت یہ فضیلتیں حاصل ہوئی ہیں۔

"شاعر اپنے اس خیال کی بنا پر ظاہری بد نصیبی کو حقیقی خوش نصیبی سمجھتا ہے اور اس طرح غم میں خوشی، مصیبت میں تسکین اور مایوسی میں امید کا ایک زبردست پہلو نکال کر اپنے دل کو افسردہ اور طبیعت کو مردہ نہیں ہونے دیتا اور مردانہ وار تمام تکلیفوں کا مقابلہ کرنے کو تیار رہتا ہے۔"[1]

۱۹۲۹ء ہی میں "ہماری شاعری" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس ایڈیشن میں ضمیمۂ کتاب کے طور پر یہ شرح بھی شامل تھی۔ اس طرح یگانہ کے شعر کو "ہماری شاعری" میں امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی اور اسی کے ساتھ یہ شرح ادیب اور یگانہ کے دوستانہ تعلقات کی مزید استواری کا ذریعہ بھی بنی۔ ادیب پہلے ہی سے یگانہ کی شاعری اور ان کے مردانہ کردار کے قائل تھے۔ اب یگانہ بھی ادیب کی بڑی قدر کرنے لگے۔ چنانچہ جب رسالہ "ادبی دنیا" لاہور کے جنوری ۱۹۳۰ء کے شمارے میں "ہماری شاعری" پر صابر علی خاں کے اعتراضات اور اپریل ۱۹۳۰ء کے شمارے میں مرزا جعفر حسین کی طرف سے اُن کا جواب شائع ہوا تو یگانہ نے ماہنامہ "نیرنگِ خیال" لاہور (مئی ۱۹۳۰ء) میں "ہماری شاعری کی حمایت کرتے ہوئے لکھا :

"وہ کون صاحب ہیں جنہوں نے "ادبی دنیا" میں سید مسعود حسن رضوی ادیب کی معرکتہ الآرا کتاب "ہماری شاعری" پر حاسدانہ حملے کیے ہیں۔ یہ تو وہ کتاب ہے

---

[1] "ہماری شاعری" طبع دوم ص ۱۹۷

جو یورپ زدہ اصحاب کی غلامانہ ذہنیت میں انقلاب پیدا کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتی ہے۔"[1]

○

۱۹۳۳ء میں یگانہ کی رباعیوں کا مجموعہ "ترانہ" شائع ہوا جس کا ایک نسخہ انہوں نے ادیب کو بھیجا۔ اس وقت تک یگانہ غالب کے سخت مخالف ہو چکے تھے۔ "ترانہ" میں کئی رباعیاں ایسی تھی جن میں غالب پر حملے کیے گئے تھے۔ ادیب نے "ترانہ" کی رسید میں یگانہ کو جو خط لکھا اس میں یہ بھی لکھا کہ اگر یہ رباعیاں کتاب میں شامل نہ ہوتیں تو بہتر تھا۔ اس کے جواب میں ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو یگانہ نے ادیب کو ایک لمبا خط لکھا جس میں غالب اور غالب پرستوں پر مختلف اعتراضات کے علاوہ غالب کے سلسلے میں اپنے موقف کی وضاحت بھی کی۔ ادیب کو یہ خط اس قابل معلوم ہوا کہ اس کو چھپوا دیا جائے۔ انہوں نے یگانہ کو خط لکھ کر یہی خیال ظاہر کیا۔ یگانہ نے اس بارے میں ادیب کو جو خط[2] لکھے اُن کے کچھ اقتباس حسب ذیل ہیں :

۲۷ر فروری ۱۹۳۴ء: "آپ کا پوسٹ کارڈ مورخہ ۲۳ر فروری موصول ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میرے اس طویل مکتوب میں کچھ نہ کچھ صداقت محسوس کی ہے اور غالباً اسی وجہ سے شائع کرا دینے کا ارادہ ظاہر فرمایا ہے۔ بہت مناسب ہے اگر یہ شائع کر دیں۔ جہانگیر، عالمگیر، نیرنگِ خیال، جس میں چاہیے چھپوا دیجیے۔ نیرنگِ خیال ہو تو زیادہ اچھا ہے۔"[2] (از لاتور، دکن)

۱۴ر مارچ ۱۹۳۴ء: "آپ نے میرے مکتوب کو چھپوانے کا جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس کے متعلق اک بات عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ اس مکتوب کی ایک نقل میں نے اڈیٹر نیرنگِ خیال کو بھیج دی تھی اور مجھے یاد پڑتا ہے اس نقل میں

---

[1] بہ حوالہ "مسعود حسن رضوی : حیات اور کارنامے" تحقیقی مقالہ از ڈاکٹر طاہر تونسوی (قلمی) ص ۱۹۷

[2] "خطوطِ مشاہیر بہ نام سید مسعود حسین رضوی ادیب" : مرتبہ نیر مسعود، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۵ء

بعض فقروں کا اضافہ ہوگیا ہے۔ آپ وہ خط ایڈیٹر نگِ خیال سے حاصل کر کے ملاحظہ کر لیں تو اور اچھا ہے۔ اس کے بعد جس پرچے میں چاہیں چھپوا دیں۔ مگر مجھے بھی اطلاع فرما دیں کہ وہ مکتوب کس پرچے میں بھیجا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس پرچے میں چھپے اس کی پچیس کاپیاں بہ ضرورتِ خاص خرید لوں، بلکہ پہلے سے پچیس کاپیاں زائد چھاپنے کا آرڈر دے دوں۔" (از لاتور دکن)

۱۷/ اپریل ۱۹۳۴ء: "میں حیدر آباد سے واپس آیا تو آپ کا عنایت نامہ ملا جس سے معلوم ہوا کہ میرا مکتوب آپ نے جہانگیر کو بھیج دیا ہے۔ میں نے بھی ان کو اجازتِ تحریری بھیج دی ہے۔" (از لاتور دکن)

۱۳/ مئی ۱۹۳۴ء: "ساقی" دہلی کا اپریل اور مئی نمبر آپ کی نظر سے گزرا یا نہیں؟ میاں مضحک دہلوی اور بدایوں کے ایک امرد لڑکے (ماہر القادری) نے خوب خوب جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ پیٹ بھر کے مجھے گالیاں سنائی ہیں۔ میں نے کئی بار دونوں کی بکواس کو پڑھا۔ دیر تک ہنستا رہا۔ اچھی خاصی تفریح ہوگئی۔ گویا یہ لوگ غالبؔ کی محبت کا حق ادا کر رہے ہیں۔ کتنے نادان ہیں غریب جنھے سچ مچ غالبؔ کا دشمن سمجھ لیا ہے۔ مکتوب یگانہ کی اشاعت کا انتظار ہے۔ دیکھیے کب تک شائع ہوتا ہے۔" (از لاتور، دکن)

۱۹۳۴ء ہی یگانہ نے یہ مکتوب "غالب شکن" کے نام سے کتابی صورت میں چھپوا کر شائع کر دیا ہے۔ اس کے سرورق کی عبارت حسب ذیل ہے:

"بہ نام یگانہ"

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجیے
آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

غالب شکن

مکتوبِ یگانہ

بہ نام سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

از

امام الغزل

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

سب رجسٹرار حیدرآباد دکن

۱۹۳۴ء

"۵۰۰ جلد"

شروع میں یگانہ نے حاشیے پر یہ نوٹ دیا ہے :

"اصل خط دست یاب نہ ہو سکا. مکرر مسودّہ کیا گیا جس سے جا بجا کچھ اختلاف ہونا فطری ہے."

اس پہلے ایڈیشن میں ۳۲ صفحے ہیں جن میں سے ۲۰ صفحوں میں خط آیا ہے اور آخر کے ۱۲ صفحوں میں غالب کے خلاف ۲۴ رباعیاں ہیں۔

دوسرے سال یگانہ نے غالب شکن" کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا اور کتاب کے نام میں "غالب شکن" کے ساتھ قوسین میں" دوآتشہ" کا اضافہ کیا اور اپنے نام میں "میرزا یگانہ چنگیزی لکھوی" کے ساتھ "علیہ السلام" لگا دیا. ابتدائی نوٹ کو انہوں نے اس طرح بدل دیا۔

"نظرِ ثانی میں جا بجا اضافہ کیا گیا ہے اور چوریوں کے ثبوت میں ایک جدید باب بڑھا دیا گیا ہے."

یہ دوسرا ایڈیشن ۸۰ صفحے کا ہے. اس خط میں ۲۰ صفحے سے بڑھ کر ۶۸ صفحے کا ہو گیا اور آخر کے ۱۲ صفحوں میں رباعیوں کی تعداد ۲۴ سے ۳۲ ہو گئی۔

○

۱۹۳۵ء ہی میں "ہماری شاعری" کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا. کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں جن مشاہیر کے تبصرے اور رائیں درج تھیں ان میں یگانہ شامل نہیں تھے۔ لیکن

تیسرے ایڈیشن میں یگانہ کی مندرجہ ذیل رائے شامل ہے:

"ہماری شاعری کے مطالعے سے خیالات میں نہایت صحیح اور مفید انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ یورپ زدہ دماغوں کی اصلاح کے لیے یہ نہایت صحیح نسخہ ہے۔..... اردو اور فارسی شاعری کو صحیح طور پر سمجھنے اور صحیح روشنی میں دیکھنے کے لیے ایک خاص معیار قائم کرنا پڑے گا اور یہ معیار ہماری شاعری میں قائم کر دیا گیا ہے۔" [1]

اور چوتھے ایڈیشن (۱۹۴۴ء) میں اس رائے کے ساتھ مندرجہ ذیل فقروں کا اضافہ ہوا:

"تعلیم یافتہ اصحاب نظری حیثیت سے تو شعر و سخن کے فلسفے اور لقب العین پر بہت کچھ خامہ فرسائیاں کرتے رہتے ہیں مگر اب تک کوئی ایسی تصنیف نظر سے نہیں گذری جو شعر کہتے وقت عملی طور پر اصولی حیثیت سے شاعر کو مدد دے سکے۔ نہ ایسی کوئی تصنیف دیکھی جس سے شعر فہمی کا ملکہ پیدا ہو سکے اور مغز سخن تک پہنچنے کا صحیح راستہ معلوم ہو سکے۔ البتہ آپ کی اس تصنیف نے شعر فہمی کی بہت سی راہیں کھول دی ہیں جن کی بدولت ایک صحیح المذاق بہت کچھ ترقی کر سکتا ہے۔" [2]

○

اسی عرصے میں مولوی بیخود موہانی نے "ہماری شاعری" پر اعتراضات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب "آئینہ" لکھیں۔ اس مجوزہ کتاب کی جلد اول کی صرف دو قسطیں "جوہر آئینہ" اور "منظر آئینہ" ایک سال کے وقفے سے ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئیں [3]۔ یگانہ سے بھی بیخود کا جھگڑا ہو چکا تھا۔ "ہماری شاعری" میں ادیب نے یگانہ کے

---

[1] و [2] منقول از مسودہ "ہماری شاعری" طبع سوم ترمیم شدہ برائے طبع چہارم۔

[3] دونوں میں سے کسی کتاب پر بھی سالِ طباعت درج نہیں ہے۔ لیکن "جوہر آئینہ" کے آخر میں کتاب کی تکمیل کی تاریخ ۱۵ نومبر ۱۹۳۴ء ہے (ص ۴۲)۔ میرے پیشِ نظر اس کا جو مطبوعہ نسخہ ہے وہ بیخود نے علی عباس حسینی کو ۱۲ دسمبر
(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

جو دو شعر تڑپ اور بلندی کی مثال میں درج کیے تھے ان پر بھی بیخود نے اعتراض کیے اور دونوں شعروں پر اصلاح بھی دے دی۔ ادیب نے ان اعتراضوں کے تفصیلی جواب دینے کے ساتھ بیخود کی اصلاحوں کی غلطیوں پر بھی روشنی ڈالی۔ ان میں سے ایک جواب ماہنامہ "فردوس" لکھنؤ کے فروری، ۱۹۳۷ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ جوابات کے سلسلے کا پہلا مضمون ماہنامہ "الناظر"، لکھنؤ، اکتوبر، نومبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس دوران یگانہ نے ادیب کے نام بعض خطوں میں بیخود کے خلاف بہت سخت الفاظ استعمال کیے۔ اسی زمانے میں ان کی یہ خواہش ابھر کر سامنے آگئی کہ ادیب ان کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیں۔ اگرچہ یگانہ کے شعری مجموعے "آیات وجدانی" میں میرزا امراد بیگ چغتائی کے تفصیلی "محاضرات" شامل تھے اور ان میں یگانہ کی شاعری کی اتنی تعریف تھی کہ اس میں اضافے کی گنجائش کم رہ گئی تھی، لیکن چونکہ یہ خیال عام تھا کہ یہ محاضرات خود یگانہ کے لکھے ہوئے ہیں اس لیے ادبی دنیا پر اُن کا خاطر خواہ اثر نہیں پڑا، لہذا یگانہ چاہتے تھے کہ کوئی معروف نقاد ان کے کلام پر تبصرہ کرے۔ وہ ادیب کی سخن فہمی کے قائل تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ادیب ان کی شاعری کے مدّاح ہیں، چنانچہ جب "الناظر" والے جوابی مضمون کی اشاعت کے بعد یگانہ نے ادیب کو ایک خط لکھا تو بیخود کی تنقیص کے بعد اپنی اس خواہش کا یوں اظہار کیا :

"اچھا یہ تو فرمائیے آیاتِ وجدانی کی شرح و تنقید و محاکمہ آپ کریں گے ؟ — موجودہ شرح[1] جو چھپی ہوئی ہے وہ اک ادھوری چیز ہے۔ میں تو اپنے اصول، اپنے کیرکٹر (خصوصاً جنگ جوئی) کے سبب اپنے سرمایۂ ادب کو ضائع کر چکا۔ میں ضایع کرنے پر مجبور تھا۔ کیا آپ بھی آیاتِ وجدانی اور "ترانہ" کو ضائع کرنا گوارا کریں گے یا اس آرٹ سے (اگر یہ آرٹ واقعی آرٹ ہے) ملک کو روشناس

۱۹۳۴ء کو پیش کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی سال یہ کتاب شائع ہو گئی تھی۔ "منظر آئینہ" کی تاریخِ تکمیل ۲۵، اکتوبر ۱۹۳۵ء ہے۔ ادیب کی کتاب "آئینۂ سخن فہمی" (ناشر کتاب نگر، لکھنؤ ۱۹۵۹ء) انہیں دونوں کتابوں کے جواب میں ہے۔ اس کے دیباچے میں ادیب بتاتے ہیں کہ "جوہر آئینہ کی اشاعت سے تقریباً ایک سال بعد آئینہ جلد اول کی دوسری قسط منظرِ آئینہ کے نام سے نکلی" ص ح

[1] یعنی "محاضرات" از میرزا امراد بیگ چغتائی۔

کرائیں گے؟ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کوئی (Fitzgerald) ملے گا تو کب ملے گا۔ مجھے ڈاکٹر بجنوری کے جیسے دیوانے، بد تو اس شرح نگار کی ضرورت نہیں۔ ہاں رضوی جیسا سمجھا بوجھا ہوا معتدل مزاج شرح و تنقید کا حق ادا کر سکتا ہے۔"

(مورخہ ۲۱ دسمبر ۱۹۳۶ء از لاتور دکن)

لیکن ادیب یگانہ کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکے۔

○

ریاست حیدر آباد میں ملازمت کے دوران یگانہ کی ادیب سے خط کتابت رہتی تھی اور یگانہ جب لکھنؤ آتے تو ادیب سے بھی ملنے آتے تھے۔ کبھی کبھی یگانہ کی آمد پر ادیب اُن کے اعزاز میں نشست کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ ادیب کے نام اُن کے مندرجہ ذیل خط[1] میں ایسی ہی ایک نشست کا حوالہ ہے:

لاتور دکن

۲۸ ستمبر ۱۹۳۵ء

مکرمی زاد لطفکم سلام شوق

جلسے کے بعد آپ سے رخصت ہو کر گھر آیا۔ دوسرے دن سے سخت تپ و لرزہ میں مبتلا ہوا۔ بخار ہنوز باقی تھا کہ ۲۰ ستمبر کو دکن روانہ ہو گیا۔ اسی ناسازیٔ مزاج کے سبب آپ سے اور دیگر احباب سے چلتے وقت مل بھی نہ سکا۔ جلسے کے جملہ حاضرین سے مل کر میں خوش ہوا۔ آپ نے اس گدائے متکبر کے لیے جو صحبت منعقد کی وہ آپ کی قدر شناسی کی دلیل ہے ورنہ میں جس برتاؤ کا مستحق ہوں وہ غالباً آپ سے پوشیدہ نہیں۔ جمیع یادفرمایانِ باصفا کی خدمت میں سلام

---

[1] "خطوطِ مشاہیر بہ نام سید مسعود حسن رضوی ادیب" میں ادیب کے نام یگانہ کے خط بھی شامل ہیں، لیکن چونکہ یہ خط اس مجموعے میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے اس لیے یہاں پورا نقل کیا جاتا ہے۔

شوق۔ کیا ان آنظر لکھنؤ میں میرے خلاف کوئی پروپگنڈا شروع ہوا ہے؟۔

نیازمند

میرزا یگانہ چنگیزی"

ان نشستوں میں یگانہ اپنا کلام بھی سناتے تھے۔ اُن کا ترنم دل کش اور پُر سوز تھا۔ ادیب اُن کے پڑھنے کی بہت عمدہ نقل کرتے تھے۔ میں نے بارہا ادیب سے یگانہ کے یہ شعر یگانہ ہی کے لحن میں سُنے ہیں :

ہاں مناسب ہے جو صیاد گلا گھونٹ دے اب
سوتے فتنوں کو اسیروں نے جگانا چاہا
اور اک چرخِ ستمگار نے کروٹ بدلی
زانوے فکر سے جب سر کو اٹھانا چاہا
جامہ زیبوں پہ کفن نے بھی دیا دہ جوبن
دوڑ کر سب نے کلیجے سے لگانا چاہا

وہ شعر کے دونوں مصرعوں کو دو دو بار پڑھتے، پھر مصرعِ اولیٰ کے چند ابتدائی لفظوں پر شعر کو ختم کرتے تھے بمندرجۂ بالا شعر "ہاں مناسب ہے"، "اور اک چرخ"، اور "جامہ زیبوں پہ" کے لفظوں پر ختم ہوتے تھے۔

دکن سے لکھے جانے والے خطوں میں یگانہ ادیب کو کبھی اپنا حال لکھتے، کبھی ان سے حالات دریافت کرتے یا کوئی کام ہوتا تو لکھتے تھے، مثلاً :

"بہت دنوں سے آپ کا حال کچھ معلوم نہیں کبھی کبھی دور افتادگانِ بزم کو بھی یاد کر لیا کیجیے تو کیا برا ہے"....

"کشتگان و زخم خوردگانِ "میرزا غالب شکن" کا کیا حال ہے؟ آپ تو بہت کچھ تماشے دیکھا کرتے ہوں گے"۔ (۷، فروری ۱۹۳۶ء)

"نوازش نامہ اور نگار کا مطلوبہ پرچہ پہنچا۔ بہت بہت شکریہ۔ مگر

میرے ذہن میں یہ بات نہ آئی تھی کہ پرچے کے لیے خود آپ کو دفتر نگار میں
جانا پڑے گا، ورنہ آپ کو اتنی تکلیف نہ دیتا، خیر۔"

(۲۱ر دسمبر ۱۹۳۶ء)

۷ر نومبر کو (Irony of time) کے عنوان سے جو اک پرائیویٹ
خط میں نے لکھا تھا اس کا جواب ہنوز عدم وصول ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خوبی وقت
ہی نے آپ کو بھی مجبور رکھا، اس کے سوا کوئی بدگمانی آپ جیسے شخص سے نہیں
ہو سکتی.....

"اتفاق وقت ہے کہ میں آج کل اچانک آفت میں مبتلا ہوں چھ مہینے
سے تنخواہ بند ہے۔" (۲۰ر نومبر ۱۹۳۷ء)

"میں اپنا حال کسی سے کیا کہوں۔ بہ قول خواجہ آتش:

خدا کرے نہ تمہیں میرے حال سے واقف
نہ ہو مزاجِ مبارک ملال سے واقف

(۱۱ر نومبر ۱۹۴۹ء)

○

ملازمت سے سبک دوش ہو کر لکھنؤ آنے کے بعد سے یگانہ قریب قریب خانہ نشیں
ہو گئے تھے۔ ادیب سے بھی ان کی ملاقاتیں برائے نام رہ گئی تھیں۔ ایک بار انہوں نے
ادیب سے کلیاتِ میر طلب کیا اور کہا کہ جب میں اسے واپس کروں گا تو آپ خوش
ہو جائیں گے۔ اس کے بعد وہ کہیں باہر چلے گئے اور کلیاتِ میر انہیں نہیں مل سکا۔ ادیب
کا خیال تھا کہ یگانہ اُس کی تصحیح کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اس لیے کہ وہ میر کا کلام غلط
سلط چھپنے کی شکایت اکثر کیا کرتے تھے۔[۱]

---

[۱] مجھے خیال آتا ہے کہ یگانہ نے اپنے ایک مضمون میں مطبوعہ کلامِ میر کی بعض غلطیوں کی تصحیح بھی کی
تھی۔ (نیر مسعود)

۳۱ مارچ ۱۹۵۳ء کو یگانہ کے مکان پر حملہ ہوا اور شہر میں رسوائی کے ساتھ ان کا جلوس نکالا گیا۔ اس زمانے میں وہ سلطان بہادر روڈ والے مکان میں تھے۔ اس واقعے کے بعد کچھ عرصے تک ان کی حفاظت کے لیے ان کے مکان پر پولس کی طرف سے پہرا لگایا گیا، لیکن محلّے والے وہاں ان کے قیام کے روادار نہیں تھے۔ آخر کار جولائی میں وہ تھوڑا سا سامان لے کر اور مکان کو مقفل کر کے محلہ شاہ گنج کے پہلے مکان میں آ گئے۔ یہ مکان ادیب کے مکان "ادبستان" کی پشت سے متصل حامد اللہ افسر میرٹھی کے مکان[1] کے سامنے ہے۔ کچھ دن بعد سلطان بہادر روڈ والے مکان پر دوسروں نے قبضہ کر لیا اور یگانہ کا سامان خورد برد کر دیا۔ قریب دو سال تک یگانہ پہلے مکان اور محلہ شاہ گنج ہی کی ایک اور گلی میں (نخاس پولیس چوکی کی پشت پر) رہتے رہے۔ یہ اُن کے لیے سخت پریشانی کا دور تھا۔ اسی زمانے میں ۱۱ نومبر ۱۹۵۴ء کو انھوں نے ادیب کو یہ خط لکھ کر بلایا:

> "کرم فرمائے بندہ سلام شوق
>
> ظاہر ہے میں کن مشکلوں میں ہوں۔ آپ ذرا تکلیف فرمائیے تو کچھ اور عرض کروں۔ اب تک کچھ معلوم نہ ہوا کہ حسینی صاحب نے جو وعدہ فرمایا تھا جناب سے سفارش کرنے کا...... تو گفتگو کا موقع آیا یا نہیں۔
>
> میرزا یگانہ"

یگانہ کو خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ انہیں قتل کر دیا جائے گا، اس لیے انھوں نے ادیب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کو "ادبستان" میں پناہ دی جائے (مندرجۂ بالا خط میں علی عباس حسینی مرحوم کی سفارش کا ذکر بھی غالباً اسی سلسلے میں ہے)۔ ادیب نے انہیں اپنے کمرے کی پیش کش کی جس کو انھوں نے منظور نہیں کیا اور اصرار کرتے رہے کہ انہیں باہر کی طرف نوکروں کے کسی کوارٹر میں جگہ دے دی جائے۔ اس وقت "ادبستان" کے باغ میں مالی کا کوارٹر خالی تھا۔ یہ ایک کوٹھری نما کمرہ تھا جس کے آگے کوئی برآمدہ یا کھپریل نہیں تھی۔ یگانہ نے ادیب سے

---

[1] افسر مرحوم کا مکان اب دوسروں نے خرید لیا ہے (نیر مسعود)

کہا کہ اسی کوارٹر کے آگے ایک چھپر ڈلوا دیجئے۔ ادیب کے انکار کے باوجود انہوں نے چھپر ڈالنے کے لیے سو روپے کا ایک نوٹ دیا اور تھوڑے دن میں کوارٹر کے آگے چھپر تیار ہوگیا۔

یگانہ پر حملہ کرنے والوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ "ادبستان" میں ان کے قیام کا بندوبست ہو رہا ہے تو ان کے ایک وفد نے ادیب سے ملاقات کر کے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ یگانہ کو اپنے یہاں نہ ٹھہرائیں۔ یگانہ کی بد اعتقادیوں کے ثبوت میں ان لوگوں نے کچھ مسوّدے پیش کیے جو اُن کے سلطان بہادر روڈ والے مکان سے برآمد ہوئے تھے۔ دوارکا داس شعلہ کو یگانہ نے اس سلسلے میں لکھا تھا :

"سلطان بہادر روڈ سے جب نکلا ہوں تو سارا گھر یوں ہی چھوڑ کر نکلا تھا۔ گرہستی کا سارا سامان لوٹ لیا گیا اور رنج تو اس کا ہے کہ زندگی بھر کی کمائی (Manuscript) بھی لٹ گئی۔ کون جان سکتا ہے کہ اس دفترِ پریشاں میں کیا کیا چیزیں تھیں"۔[۱]

ادیب کے سامنے اسی "دفترِ پریشاں" کی کچھ چیزیں تھیں۔ ان میں قرآن مجید کا ایک نسخہ تھا جس کے حاشیوں پر یگانہ نے اپنے اختلافی نوٹ لکھے تھے۔ اس کے علاوہ اقبال کے خلاف کچھ بہت سخت مضمون تھے۔ ان مضامین کے ایک صفحے پر لفظ "اکبال" کو چھوٹے چھوٹے طغروں کی شکل میں اتنی مرتبہ لکھا تھا کہ وہ صفحہ کسی کتاب کا سرورق معلوم ہونے لگا تھا۔ ادیب نے بہرحال وفد سے کہہ دیا کہ ایک دوست کو پناہ دینے کا وعدہ کر لینے کے بعد وہ اس سے پھر نہیں سکتے۔

وسطِ جون ۱۹۵۵ء میں یگانہ "ادبستان" آگئے۔ وہ بیمار اور کسی مناسب خدمتگار کے لیے پریشان تھے۔ میں نے اس زمانے میں ان کے پاس دو ملازم دیکھے۔ ایک تو ایک بزرگ نما آدمی تھے اور دوسری ایک بوڑھی عورت۔ یہ عورت کبھی کبھی گھر کے اندر آ کر بیگم ادیب سے یگانہ کی تند مزاجی کی شکایتیں کرتی تھی۔ ایک بار وہ روتی ہوئی آئی کہ یگانہ خود

---

[۱] "تخلیقی ادب" ۲۔ مرتبہ مشفق خواجہ ص ۵۲۲،۵۲۱

ہی اس سے بدن دبانے کو کہتے ہیں اور جب وہ دبانے لگتی ہے تو اسے دور دھکیل کر کہتے ہیں :

"بھاگ جا، بھاگ جا، تو جوان ہے جوان"

بزرگ نے بھی ادیب کے ذاتی ملازم جانی مرزا سے شکایت کی کہ یگانہ ان کی داڑھی پر اعتراض کرتے ہیں۔

اس زمانے میں یگانہ کی غذا بہت قلیل اور زیادہ تر اُبلی ہوئی ترکاریوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ البتہ چائے اور سگریٹ وہ بہت پیتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں پاسنگ شو سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے ایک بالٹی بھر گئی تھی۔ ان میں سے بعض ڈبیوں کو پورا کھول کر ان کے سادے رُخ پر یگانہ نے لال اور نیلی پنسل سے اپنی پرانی غزلوں کے کچھ شعر لکھے تھے۔

یگانہ کا کوارٹر "ادبستان" کے برآمدے سے (جہاں ادیب آنے والوں سے ملاقات کرتے تھے) چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ کبھی کبھی وہ ادیب سے باتیں کرنے کے لیے برآمدے میں آ بیٹھتے تھے۔ بیماریوں اور دوسری پریشانیوں کے باعث وہ اپنی عمر (۷۱ سال) سے زیادہ بوڑھے نظر آتے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپتے رہتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے اپنے آپ ان کی گردن جھکتی چلی جاتی، ٹھوڑی سینے سے جا لگتی اور وہ چونک کر ایک جھٹکے کے ساتھ سر اونچا کر لیتے تھے۔ اس وقت انہیں دیکھ کر چوٹ کھائے ہوئے سانپ کا خیال آتا تھا۔ ان موقعوں پر ادیب سے گفتگوؤں میں وہ ایک فقرہ بار بار دہراتے تھے :

"دیکھیے مسعود صاحب، میں ہارا نہیں، ہارا نہیں"

وہ اس بات کا بھی فخر کے لہجے میں ذکر کرتے تھے کہ ان کے سوا کسی شاعر کا جلوسِ رسوائی نہیں نکلا[1] اور

---

[1] یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ ۶۰ھ اور ۶۴ھ کے درمیان عبید اللہ بن زیاد کے حکم سے مشہور عربی شاعر یزید بن مفرّغ کو شراب کے ساتھ جُلاب پلا کر اور ایک کتے، ایک بلی اور ایک سُور کے ساتھ باندھ کر بصرے میں اس کا جلوسِ رسوائی نکالا گیا تھا (اس حالت میں ابنِ مفرّغ نے فارسی میں جو فی البدیہہ شعر کہے تھے وہ بعدِ اسلام کی فارسی شاعری کا قدیم ترین نمونہ ہیں)۔ اس قسم کی کچھ اور مثالیں بھی مل جائیں گی، لیکن مشہور اردو شاعروں کی حد تک یگانہ کا یہ دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے۔ (نیر مسعود)

اس معاملے میں خود کو حضرتِ عیسیٰؑ کا ہم رتبہ ٹھہراتے تھے۔ایک بار کوئی بات کہتے کہتے وہ رُکنے لگے، پھر بگڑ کر بولے :

"آپ دیکھ رہے ہیں ؟ مجھے معلوم ہے کہ کیا کہنا چاہتا ہوں، مگر لفظ ڈھونڈھ رہا ہوں تو نہیں ملتے !"

اس پر ادیبؔ نے صفیؔ لکھنوی کا ذکر کیا کہ ان کی قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ ڈائس پر بیٹھ جانے کے بعد وہ اپنی پوری صدارتی تقریر فی البدیہہ نظم کر دیتے تھے، لیکن آخر عمر میں ان کا یہ حال ہو گیا تھا کہ سیدھی سادھی بات کہنے کے لیے بھی دیر تک "یہ" اور "وہ" اور "کیا کہتے ہیں" کیا کرتے تھے۔ یگانہؔ نے یہ ذکر سُن کر کچھ نہیں کہا لیکن ان کے چہرے سے ناگواری ظاہر ہو رہی تھی، اس لیے کہ صفیؔ وغیرہ سے ان کی سخت معرکہ آرائی رہ چکی تھی۔

انہیں ملاقاتوں میں ایک دفعہ ادیبؔ نے کوئی لطیفہ سُنایا تو یگانہ بے اختیار ہنسنے لگے اور دیر تک ہنستے رہے، پھر اچانک رُک گئے اور بِھر کر بولے :

"دیکھا آپ نے؟ اب ہنستا ہوں تو بُرا لگتا ہے!"

"ادبستان" میں یگانہؔ ایک ماہ چوبیس دن تک رہے۔ ۹ راگست ۱۹۵۵ء کو اطلاع ملی کہ وہ کوارٹر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ پھر ادیبؔ کے نام ان کا یہ پرچہ پہنچا :

"مائی ڈیر سلامِ شوق

موسم کی سختیوں نے مرض کی شدت کو اور بڑھا دیا۔ رات بھر آگ جلاتا رہا۔ طبیعت بے حال رہی چلتے وقت آدمی سے کہہ دیا کہ صاحب کو میرے جانے کی اطلاع کر دینا۔ غالباً اطلاع ہو گئی ہوگی۔ زیادہ اس وقت کیا عرض کروں۔

کمترین

میرزا یگانہؔ

۹ راگست سنہ ۵۵ء"

"ادبستان" سے یگانہؔ اپنی آخری قیام گاہ پہلے مکان میں منتقل ہو گئے تھے جہاں سے

انہوں نے ۹ر ستمبر کے ایک خط میں شعلہ کو اطلاع دی :

"پروفیسر مسعود حسن کے باغ میں چھپر ڈال کر ایک مہینا چوبیس دن رہا۔ مگر برسات کا زور بندھا تو پھر میں زمین پر نہ تھا، آب و گل میں پڑا تھا اور مرض کی شدت نے اور پریشان کیا۔ آخر مجبور ہو کر ۹ر اگست کو پھر یہاں چلا آیا۔"[۱]

لیکن موسم اور مرض کی سختیوں کے علاوہ یگانہ کے ترکِ قیام کا ایک قوی تر سبب اور بھی تھا۔ "ادبستان" کے باغ کے نیچے سے ایک نالہ گذرتا ہے (جو کوچۂ میر انیس کے پاس پہنچ کر سرکٹا نالہ کہلاتا ہے اس لیے کہ عہدِ شاہی میں وہاں مجرموں کے سر کاٹے جاتے تھے) لکھنؤ میونسپلٹی نے اس زیرِ زمین نالے کو کئی گنا چوڑ کرنے کا منصوبہ بنایا اور باغ کی زمین کھودنے کے لیے پیمائش کا کام شروع کر دیا۔ یگانہ کا کوارٹر اور چھپر اس پیمائش کی زد میں آرہا تھا اور ان کے پوچھنے پر پیمائش کرنے والوں نے بتایا کہ یہ کوارٹر بھی منہدم کر دیا جائے گا۔ ادیب نے انھیں سمجھایا بھی کہ کوارٹر کھدنے کی نوبت آنے میں ابھی بہت دن ہیں اور میونسپلٹی سے بات ہو رہی ہے کہ وہ باغ ہی میں کسی دوسری جگہ پر متبادل کوارٹر بنوا دے[۲]۔ لیکن یگانہ کی طبیعت اکھڑ گئی تھی اور وہ "ادبستان" سے کہیں اور منتقل ہونے کا ارادہ کرنے لگے تھے۔ برسات کی وہ سرد رات اس ارادے پر عمل کرنے کا حیلہ بن گئی۔

○

"ادبستان" سے جانے کے بعد یگانہ پانچ دن کم چھ مہینے زندہ لیکن بیمار رہے۔ اس عرصے میں ادیب ایک دو بار انہیں دیکھنے گئے۔ ۴ر فروری ۱۹۵۶ء کو یگانہ کی وفات ہوئی۔ ان کی تدفین خاموشی اور رازداری کے ساتھ ہوئی۔ ادیب اس زمانے میں پاؤں کی ایک جلدی تکلیف کے سبب جوتا چپل نہیں پہن سکتے تھے اس لیے بھی وہ یگانہ کی تدفین میں شریک نہ ہو سکے۔ لیکن اس کے بعد کئی دن تک وہ یگانہ کی باتیں کرتے اور ان کے شعر پڑھتے رہے۔

---

[۱] "تخلیقی ادب" ۲ ص ۵۲۸

[۲] میونسپلٹی نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ یگانہ والا کوارٹر کھد کر زمین کے برابر ہو چکا ہے (نیر مسعود)

وہ اس بات کا خاص طور پر ذکر کرتے تھے کہ یگانہ کی ہنگامہ خیز اور تند و تلخ تحریروں کو دیکھ کر لوگ سمجھتے تھے کہ ان تحریروں کے جواب میں جب خود ان کی شخصیت پر حملے ہوتے تھے تو اُن پر کوئی اثر نہ ہوتا ہوگا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ ان حملوں سے انہیں اتنی ہی شدید تکلیف ہوتی تھی جتنی کسی بھی ذکی الحس اور غیرت مند آدمی کو اپنی اہانت سے ہو سکتی ہے۔

یگانہ کی وفات کے کئی برس بعد ان کی صاحبزادی نے باپ کی قبر کو پختہ کرانے اور اس پر کتبہ لگوانے کا فیصلہ کیا۔ کتبے کی عبارت کی تیاری میں ادیب کا مشورہ بھی شامل تھا اور جب قبر تیار ہوگئی تو وہ اسے دیکھنے گئے۔ کتبے پر یگانہ کا وہی شعر کندہ ہے جو ادیب کے نام ان کے مکتوب "غالب شکن" کے سرورق پر درج ہے :

" خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے ...... "

○

میرزا یگانہ چنگیزی کی قبر کربلائے منشی فضلِ حسین خاں میں ہے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۷۵ء کو سید مسعود حسن رضوی ادیب (وفات ۲۹ نومبر) کی تدفین بھی اسی کربلا میں ہوئی۔ اسی کربلا میں مولوی سید محمد احمد بیخود موہانی بھی دفن ہیں۔ اس طرح آغازِ کار کے یہ تینوں دوست انجامِ کار پھر یکجا ہو گئے ہیں۔

یگانہ کے معرکے

میرزا یگانہ چنگیزی ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ آئے تھے۔[۱] یہ شہر انھیں پسند آیا اور انہوں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت ان کی عمر اکیس بائیس سال کی تھی اور وہ نہ یگانہ تھے نہ چنگیزی۔ اس وقت وہ مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی تھے۔ مشاعروں میں ان کا کلام پسند کیا جاتا تھا، لیکن لکھنؤ کی ادبی فضا پر اس وقت صفی، ثاقب، عزیز وغیرہ چھائے ہوئے تھے۔ جنہوں نے لکھنؤ کی روایتی غزلیہ شاعری سے کسی قدر انحراف کر کے غالب کی تقلید اختیار کی تھی۔ ان مقبول عام شاعروں کی خوشنودی حاصل کیے بغیر کسی بیرونی شاعر کا لکھنؤ کے ادبی میدان میں قدم جمانا دشوار تھا۔ لیکن یاس عظیم آبادی کے تیوروں سے بہت جلد ظاہر ہونے لگا کہ انہیں ان شاعروں کی کوئی خاص پروا نہیں اور ان کے مقابلے میں شہر کے پرانے استادوں کو زیادہ مستند سمجھتے ہیں، چنانچہ انہوں نے شاد عظیم آبادی کا شاگرد ہونے کے باوجود لکھنؤ میں میر انیس کے نواسے پیارے صاحب رشید سے اپنی چند غزلوں پر اصلاح بھی لی۔ اس سے لکھنؤ کی فضا میں ایک کشیدگی سی پیدا ہوئی اور یاس پر اعتراضات ہونے لگے کہ ان کی زبان ٹکسالی اور مستند نہیں ہے۔ ۱۹۱۲ء تک یاس کے اس پہلے ادبی معرکے کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔[۲] ۱۹۱۴ء میں انہوں نے "نشتر یاس"

---

[۱] "آیاتِ وجدانی" طبع سوم۔ اعظم اسٹیم پریس، حیدر آباد دکن ۱۹۴۵ء ص ۸

[۲] ایضاً: "میرزا یگانہ کا دورِ مقابلہ تو لکھنؤ میں ۱۹۱۲ء سے شروع ہو چکا تھا" ص ۲۷۹

کے نام سے اپنا دیوان شائع کیا جس میں پرانے استادوں نواب بہادر علی خاں انجم، مرزا اوج (فرزند مرزا دبیر)، جاوید، علی محمد عارف اور فصاحت لکھنوی (فرزند امانت لکھنوی) کی تعریفی رائیں شامل تھیں۔ یاس نے ان رایوں کو درج کرنے کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا:

"لکھنؤ کے اساتذہ سچ پوچھیے تو یہی ہیں جن کی رائیں درج کی جاتی ہیں۔"

اس کے علاوہ انھوں نے "ماہیتِ شاعری" کے عنوان سے اس دیوان کا مقدمہ لکھا اور اس کے آخر میں مزید ایک نوٹ لکھا جس کے چند فقرے یہ ہیں:

"کوئی وجہ نہیں کہ یاس کو ... لکھنؤ اہلِ زبان نہ مانے۔ جب خاندانی شعرا اور اہل زبان نے مان لیا تو معاصرینِ حال اور آئندہ نسلوں پر فرض ہے کہ یاس کی زبان اور اجتہادی تصرفات سے سند لیں ... مگر لکھنؤ کے اکثر نافہم دوسروں کے حقوق کو نہایت بے دردی سے پامال کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اہلِ انصاف کی نگاہوں میں خود ذلیل ہوتے ہیں۔"

اس طرح یاس نے گویا یہ دعویٰ کر دیا کہ ثاقب، عزیز وغیرہ کو ان کی پیروی کرنا چاہیے۔ جواب میں ان کی ہنسی اڑائی گئی۔ "نشترِ یاس" کی قیمت آٹھ آنے (موجودہ پچاس پیسے) تھی اور یاس نے اس کے کچھ شعروں پر ایک، کچھ پر دو اور کچھ پر تین صاد بنا کر اہلِ نظر کو ان شعروں کی طرف خاص طور پر متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی چنانچہ منصور نگر لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں جو آرزو لکھنوی کے شاگرد شفیق لکھنوی کے زیرِ اہتمام ہوا تھا، صفی لکھنوی کے چھوٹے بھائی ظریف لکھنوی نے، جو ہزل پڑھی اس میں یہ ہجویہ اشعار بھی تھے[1]:

میرے دیوان کی آٹھ آنے جو قیمت دیکھی   شاعروں نے نہ لیا کیا اسے رذیل سمجھے

---

[1] یہ ہزل ظریف کے کلیات "دیوانجی" (مرتبہ صفی لکھنوی، امیریہ دار التصنیف والتالیف، لکھنؤ ۱۹۴۹ء) میں شامل ہے (ص ۸۹) لیکن اس میں "آٹھ آنے" کی جگہ "آدھ آنے" چھپا ہے اور صفی نے اس پر یہ حاشیہ لکھا ہے:

"اس شعر میں کلیم کے دیوان کی طرف اشارہ ہے۔ کلیم ایک شاعر تھے اور ان سے بہت لوگ مزاح کرتے تھے۔ جب ان کا دیوان چھپا تو یار لوگوں نے ٹکے سیر بیچنا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سندیں دے کے بناتے ہیں مجھے سب شاعر — لکھنؤ والوں کی سنجیدہ ظرافت دیکھی ؟
انگھڑیاں پھاڑ کے رہ رہ گیا وہ شوخ نظر — میرے اشعار پہ جب صاد کی کثرت دیکھی
ہے مرے مُنہ میں زبان، اہلِ زباں ہوں میں ظریفؔ — آپ نے میر انقرفؔ مری جدّت دیکھی؟

اسی مشاعرے میں عزیزؔ لکھنوی کی غزل کے اس شعر پر بڑی تعریفیں ہوئیں:

دل سمجھتا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہوں گے
میں نے پردہ جو اٹھایا تو قیامت دیکھی

لیکن یاسؔ نے روزنامہ "سیّارہ" میں اس شعر کا سخت مضحکہ اڑایا اور "قیامت دیکھی" کی ایسی ایسی تاویلیں کیں کہ یہ شعر ہزل کا شعر بن کر رہ گیا۔ اب یاسؔ اور ان کے حریفوں کی باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ یاسؔ نے ایک اشتہار شائع کیا جس میں انہوں نے عزیزؔ وغیرہ کو شاعر ماننے سے انکار کیا تھا۔ اس کے جواب میں آسؔ تخلص کے ایک فرضی شاعر کی طرف سے فارسی میں رجز کے طور پر یاسؔ کی ایک ہجو چھپوا کر چوک میں تقسیم کی گئی۔ اس ہجو کے کچھ شعر یہ ہیں:

جہاں پہلوان آسؔ بُردل منم — بہ گردانِ معنی مقابل منم
نماید اگر روئے خود ہجو قیر — بہ دل یاسؔ را دیدہ دوزم بہ تیر
کہ در قلبِ مومن نہ گنجد ہراس — بود در دلِ کافراں جائے یاسؔ
دلِ کافراں ہمچو دوزخ بود — ز دوزخ پئے یاسؔ مطبخ بود

(پچھلے صفحہ کا باقی حاشیہ)

شروع کر دیا اور انہوں نے بگڑ بگڑ کر گالیاں دینا شروع کیں۔"

ظاہراً "آدھ آنے"، صفی کا تصرف اور یہ حاشیہ اصلیت کو چھپانے کی کوشش ہے، لیکن ممکن ہے مشاعرے میں (جہاں یاسؔ بھی موجود تھے) "آدھ آنے" ہی پڑھا گیا ہو اور یہ بھی ظاہر کیا گیا ہو کہ ان شعروں میں "نشتر یاسؔ" کی طرف اشارہ نہیں ہے ـــــ بہرحال لکھنؤ میں یہ شعر یاسؔ کی ہجو کے طور پر اور "آٹھ آنے" کے ساتھ مشہور ہوئے۔

(نیر مسعود)

بہ قرآں کہ خواندیم لاتقنطوا ۔۔۔ تفو بر رُخ یاسؔ اینک تفو

بہ نام خداوند بالا و پست ۔۔۔ کنم یاسؔ را نیست ہر جا کہ ہست

اس کے علاوہ یاسؔ کی ایک غزل کے شعروں پر فحش مصرعے لگائے گئے جو صفدر مرزاپوری لکھنؤ میں لوگوں کو سناتے پھرتے تھے۔

اسی زمانے (۱۹۱۴ء) میں یاسؔ نے علم عروض پر ایک کتاب "چراغ سخن" لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عروض دانی میں اُن کے حریف ان سے پیچھے ہیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے نامانوس وزن میں یہ تین شعر کہہ کر ایک اور شخص کے ذریعے صفیؔ، عزیزؔ اور ثاقبؔ کے پاس اظہار رائے کے لیے بھجوائے :

آج وہ کیوں زیر خاک سوتے ہیں آرام سے
کانوں پہ رکھتے تھے ہاتھ جو موت کے نام سے
دُنیا کی آرزو نہ دین کی آرزو
اُڑے ہیں ہوش ایسے اب گردشِ ایام سے
جلوۂ معنیٰ کجا دیدۂ حیراں کجا
باز آ اے یاسؔ[1] اس آرزوئے خام سے

صفیؔ اور عزیزؔ نے تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن ثاقبؔ نے ان شعروں کی بحر اور وزن وغیرہ کے بارے میں اپنی رائے لکھ بھیجی۔ اب یاسؔ نے ایک مضمون "میاں ثاقبؔ کی عروض دانی" شائع کیا اور اس میں ثاقبؔ کی رائے کی غلطیوں پر گرفت کی۔ ثاقبؔ نے اس مضمون کا جواب لکھا تو یاسؔ نے "میاں ثاقبؔ کی ڈھٹائی" کے عنوان سے جواب الجواب لکھا۔ اس کارروائی سے یاسؔ کو یہ جتانا مقصود تھا کہ ان کے حریف عروض کی باریکیوں سے ناواقف ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

---

[1] یاسؔ بتاتے ہیں کہ "مقطع میں یاسؔ کی جگہ کچھ اور لکھ دیا تھا" (چراغ سخن، طبع ثانی، مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۹۲۱ء ص ۱۳۸)

"یہ استفتا جناب صفی و عزیز و ثاقب کے پاس بھیجا گیا تھا کہ ان اشعار کی تقطیع کر کے بھیج دیجئے. جناب صفی و عزیز نے تو بالکل سوں کھینچی. معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں تھے ہی نہیں. تاکیدی خطوط بھجوائے گئے مگر جواب نہ دارد۔ میاں ثاقب نے جواب لکھ مارا. ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میاں ثاقب کا جواب ان اصحاب ثلاثہ کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ تینوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں. عروض دانی ان ہی لوگوں پر ختم ہے"۔ [1]

اس معرکے کے چند ماہ بعد لکھنؤ کے اخبار "اودھ پنچ" (شمارہ ۱۲ اپریل ۱۹۱۸ء) میں "سیف زبان لکھنوی" کے نام سے ایک مضمون "ادبی دنیا کا انقلاب" چھپا جس میں یاس کی ایک غزل کے چار شعروں پر اعتراض کیے گئے. اس غزل کا مقطع ہے :

نہ چھپا پر نہ چھپا جوہرِ عالی نسبی | یاس مٹنے پہ بھی خاکِ درِ مے خانہ بنے

اس مقطع پر یہ فقرہ چست کیا گیا تھا کہ اس سے شاعر کے خاندان کا پتہ چلتا ہے. اور اس پر جو مصرعے لگائے گئے تھے ان سے یاس کے والدین کی منقصت نکلتی تھی. یاس کا خیال تھا کہ یہ مصرعے جوش ملیح آبادی نے لگائے ہیں جو عزیز کے شاگرد تھے. یاس کو یہ بھی یقین تھا کہ سیف زباں لکھنوی دراصل ناطق لکھنوی ہیں جنہوں نے عزیز کے کہنے پر یہ اعتراضی مضمون لکھا ہے، چنانچہ انہوں نے میرٹھ کے رسالہ "نظارہ" میں ان اعتراضوں کے جواب دینے کے ساتھ عزیز لکھنوی کے کلام پر بھی اعتراض کر دیے. جھگڑا زیادہ بڑھتے دیکھ کر جوش نے عزیز اور یاس میں صلح کرانے کی کوشش کی جو ناکام رہی اور بالآخر یاس نے عزیز لکھنوی کے خلاف ایک پوری کتاب شائع کر دی جس کا نام انہوں نے "شہرتِ کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز" رکھا.

اہل لکھنؤ کے ساتھ یاس کے اس ادبی معرکے میں ذاتیات کی آمیزش شروع ہی سے دونوں طرف تھی اور تحریروں میں تنقید سے زیادہ تضحیک کا انداز نمایاں تھا، خصوصاً یاس کے لہجے میں بڑی جارحیت تھی، مثلاً عزیز کے اس شعر پر :

---

[1] "چراغ سخن" ص ۱۴۴

شوقِ اذانِ صبح میں بستر لگائے ہوں کعبے کی چھت پہ سونے کا ساماں کیے ہوئے

یاس کا تبصرہ یہ ہے :

"اہاہاہا! کعبے کی چھت پہ! کیا کیے ہوئے؟ سونے کا ساماں کیے ہوئے، بستر لگائے ہوں! واہ رے مصرع واہ، ترا کیا کہنا! کوئی نحوی غلطی ہو تو سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ دہقانی بدمذاقی، کوئی سمجھائے تو کیونکر۔ ذرا بلندیٔ تخیل تو دیکھیے، میاں عزیز کو کعبے کی چھت پر سونے کا شوق چڑھ آیا ہے۔ کسی بادشاہ نے ایک دفعہ کعبے کی چھت پر مے کشی کا قصد کیا تھا، آج ایک لکھنوی تکیے نے وہیں معراج کی ٹھانی ہے۔ کسی حاجی سے پوچھنا چاہیے کہ کعبے کی چھت پر سونا چہ معنی دارد؟ کیا کوئی منطقی ایسے خردماغوں کو اس مصرعے کی لغویت ذہن نشین کر سکتا ہے؟ نہ معلوم اس گومتی والے کے دماغ میں کہاں کا کوڑا ہوا ہے"۔ [1]

صفی، عزیز، ثاقب بہر حال لکھنؤ کے متین اور معزز لوگ تھے اور اس معرکے میں وہ براہِ راست یاس سے الجھے بھی نہیں، یاس کے بظاہر یک طرفہ حملوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ کی فضا ان کے خلاف ہوگئی اور ان کے بدخواہوں کی تعداد بڑھ گئی، یہاں تک کہ ان کو روزگار سے محروم اور افلاس کا شکار ہونا پڑا اور دو وقت کی روٹی کے لیے اپنے ذخیرے کی کتابیں تک بیچنا پڑ گئیں۔ مگر انہوں نے دبنے کے بجائے اپنے تیور اور کڑے کر لیے۔ پہلے وہ "مرزا یاس عظیم آبادی" تھے، پھر "مرزا یاس عظیم آبادی لکھنوی" ہوئے، پھر مرزا یاس یگانہ لکھنوی عظیم آبادی اور آخر "میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی" ہوگئے۔ [2]

---

[1] "شہرتِ کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز" (حصۂ اول) اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۵ء ص ۸۳

[2] ۱۹۲۰ء میں پٹنہ کے ایک مشاعرے میں یاس اور فصاحت لکھنوی شرکت کے لیے گئے تھے۔ وہاں یاس نے ایک فخریہ قطعہ پڑھا جس کا مقطع تھا : جان سے بڑھ کر سمجھتے ہیں مجھے یاس اہلِ دل آبروئے لکھنؤ خاکِ عظیم آباد ہوں
مشاعرے سے واپس آکر یاس نے روزنامہ "ہمدم" لکھنؤ میں یہ قطعہ چھپوا دیا جس کے جواب میں اہلِ لکھنؤ کی طرف سے ان کی ہجویں کہی گئیں اور یاس نے حریفوں کو مزید چڑانے کے لیے قطعے میں ایک یہ شعر بڑھا دیا: (اگلے صفحہ پر)

ان معرکوں کے شروع میں سید محمد احمد بیخود موہانی یگانہ کے ساتھ تھے بلکہ ان کی پشت پناہی کر رہے تھے جس کی ایک وجہ یہ بھی کہ لکھنؤ کے ان شاعروں کے ساتھ بیخود کے تعلقات بھی یگانہ ہی کی طرح کشیدہ تھے۔ افقر موہانی کے مندرجۂ ذیل بیان سے اس کشیدگی کی نوعیت واضح ہوتی ہے :

لکھنؤ میں ایک مشاعرہ تھا جس میں بیخود کو بھی مدعو کیا گیا تھا انہوں نے اس میں ایک شعر یہ پڑھا تھا :

عمرِ عزیز گذری سب خامیوں میں گذری ناکامیوں میں گذری بدنامیوں میں گذری

اتفاق سے اس مشاعرے میں لکھنؤ کے مایۂ ناز استادِ سخن مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی بھی موجود تھے۔ انہوں نے مذکورہ شعر کو اپنے اوپر حملہ سمجھا۔ پھر کیا تھا، تمام جلسہ بیخود کو قہر کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ جب بیخود کو معلوم ہوا کہ ان کا شعر حملہ سمجھا گیا تو انہوں نے اخلاقاً معذرت چاہی اور اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، مگر معذرت قابلِ قبول نہ ہوئی اور اس وقت کے تمام شعراء ان سے در پردہ کاوش و کینہ رکھنے لگے اور یہ کینہ عمر بھر اُن کے دلوں سے دُور نہ ہوا۔ وہ بیخود کو اپنا حریف اور محسود ہی سمجھتے رہے۔ مگر مرحوم نے جب اپنی اخلاقی معذرت کو بھی مسترد ہوتے دیکھا تو اپنی خود اعتمادی پر پہلے سے بھی زیادہ مستقل ہو گئے۔ درمیانی حضرات نے لاکھ چاہا کہ وہ باقاعدہ کسی اجتماع میں اپنے برگشتہ حریفوں سے از سرِ نو ارتباط و اتحاد قائم کر لیں مگر وہ مزید خوشامد پر راضی نہ ہوئے۔ پھر تو یہ شعر ان کی ہر غزل کا پیش طرح مطلع بن گیا۔ جب بھی کسی مشاعرے میں وہ غزل پڑھتے

(باقی حاشیہ)

سے لکھنؤ کے فیض سے ہیں دو دو سہرے میرے سر اِک تو استادِ یگانہ دوسرے داماد ہوں۔ (یاس کی شادی لکھنؤ ہی کے ایک خاندان میں ہوئی تھی) یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد مرزا مراد بیگ کے قلم سے یہ فقرہ لکھا گیا ہے: "یاس کے ساتھ یگانہ تخلص کرنے کی بنیاد غالباً یہیں سے پڑتی ہے۔" ("آیاتِ وجدانی" طبع اوّل۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور ۱۹۲۷ء ص ۲۱۴-۲۱۵)

تو پیش طرح اشعار میں اس شعر کو ضرور پڑھتے تھے۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر بعض نے ان سے مقاطعہ بھی کر لیا تھا۔ جہاں وہ جاتے تھے بیخودؔ کو مدعو ہی نہ کیا جاتا اور جہاں بیخودؔ ہوتے وہاں وہ جانے سے محترز رہتے۔" [1]

مقاطعے کی یہی صورت یگانہ کے ساتھ بھی اختیار کی گئی۔ اس کی کچھ تفصیل مندرجۂ ذیل بیان سے معلوم ہو سکتی ہے:

"۵ نومبر ۱۹۲۲ء کو الٰہ آباد میں پنڈت مدن موہن ناتھ ریبنہ.... نے ایک مشاعرہ کیا جس میں مرزا صاحب (یاسؔ) اور لکھنؤ کے قریب قریب تمام مشاہیر مثلاً صفیؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ، ناصریؔ، ناطقؔ...... جمع ہوئے تھے۔ مرزا صاحب کا بائیکاٹ پہلے تو لکھنؤ ہی سرزمین تک محدود تھا مگر ان غیرت دار لکھنویوں نے جب یہ دیکھا کہ آج الٰہ آباد میں مرزا صاحب کا سامنا ہو جاتا ہے...... تو... سب... نے متحد و متفق ہو کر صاحبِ مشاعرہ سے کہہ دیا کہ اگر مشاعرے میں مرزا یاسؔ کو قدم رکھنے کی بھی اجازت دی گئی تو ہم سب کے سب مشاعرے سے اٹھ کر چلے جائیں گے.... صاحبِ مشاعرہ نے.... بہت منت سماجت کی.. مگر ان.... لکھنویوں نے.... ایک نہ سنی۔ جب مرزا صاحب کو یہ حال معلوم ہوا کہ میزبان بے چارہ اس کشمکش میں مبتلا ہے تو آپ نے انہیں بلا کر یہ فرمایا کہ آپ میرے لیے کوئی غم نہ کریں، میں مشاعرے میں شریک نہ ہوں گا، جھگڑا ختم ہے۔ چنانچہ صاحب مشاعرہ نے ایسا ہی کیا۔ اور مرزا صاحب مشاعرے میں شریک نہ ہوئے......

ناواقفوں کو یہ دھوکا دیا جاتا ہے کہ ہم لوگوں نے تو مرزا یاسؔ کا بائیکاٹ

---

[1] بہ حوالہ "بیخودؔ موہانی: حیات و شاعری" از سید سکندر آغا، لکھنؤ ۱۹۷۴ء ص ۴۲-۴۳-۴۴

یہ شعر "کلیاتِ بیخودؔ" (نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۴۲ء) میں اس طرح ہے:

خود کامیوں میں گزری، ناکامیوں میں گزری — عمرِ عزیز گزری اور خامیوں میں گزری (ص ۱۱۵)

نہیں کیا بلکہ مرزا صاحب خود لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے،
سید جالبؔ نے لکھنؤ میں جو ایک مشاعرہ کیا تھا جس میں اہل لکھنؤ جمع تھے، وہاں
سے مرزا یاسؔ صاحب یہ کہہ کر اٹھ آئے تھے کہ ہم اہل لکھنؤ کے سامنے غزل پڑھنا
اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ یہ کہہ کر ناواقف پبلک کو یہ باور کرانا مقصود ہوتا ہے کہ
ہم نے مرزا صاحب کو بائیکاٹ نہیں کیا بلکہ وہ خود سید جالبؔ کے مشاعرے
سے اٹھ کر چلے آئے تو ہم نے بھی الٰہ آباد کے مشاعرے میں مرزا صاحب کو
بائیکاٹ کر دیا۔ مگر یہ کس قدر جھوٹ اور سفید جھوٹ ہے کہ مرزا یاسؔ نے
سیّد جالبؔ کے مشاعرے سے خود اہلِ لکھنؤ کا بائیکاٹ کیا۔ سید جالبؔ کا مشاعرہ
تو ۱۹۲۱ء میں ہوا ہے۔ کیا ۱۹۲۱ء تک اہل لکھنؤ نے مرزا صاحب کا بائیکاٹ
نہیں کیا تھا؟ مرزا صاحب کا بائیکاٹ تو ۱۹۲۱ء سے بہت پہلے ہو چکا ہے۔
یعنی اس سے چار پانچ سال پہلے جب مرزا صاحب کیننگ کالج کے مشاعروں
میں مدعو ہوتے تھے۔ اسی وقت سے بلکہ اس کے پہلے سے مرزا صاحب کا بائیکاٹ
قائم ہے۔ کیننگ کالج میں جس سال مرزا صاحب کو دعوت دی جاتی تھی اس سال
صفیؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ، محشرؔ ان لوگوں میں سے کوئی بھی مشاعرے میں نہ جاتا تھا۔ کچھ
دنوں تک کیننگ کالج کے طلبہ نے لکھنؤ والوں کا یہ بیجا دباؤ نہ مانا۔ ایک سال کا
مشاعرہ مرزا صاحب کے لیے وقف کر دیا اور ایک سال حضراتِ لکھنؤ کے لیے۔
کیننگ کالج کے علاوہ اور مشاعرے جو ان حضراتِ لکھنؤ کے زیرِ اثر ہوا کرتے
تھے وہاں مرزا یاسؔ مدعو نہ کئے جاتے تھے۔"[1]

اِن لکھنوی شاعروں کی انجمن "معیار الادب" کا اس وقت بڑا زور تھا۔ ظاہراً اسی انجمن کے
مقابلے پر بیخودؔ اور یگانہ نے مل کر "انجمن صاحبانِ ادب" قائم کی۔ بیخودؔ اس کے صدر اور یگانہ سکریٹری
تھے۔ ممبروں میں سائل دہلوی، رنجور عظیم آبادی، مولوی فضل علی حیدر آبادی، نجم آفندی، پیرزادہ

---

[1] "شہرتِ کاذبہ" ص ۱۔

عبدالحمید غازی آبادی، شیخ احمد علی کامل لکھنوی، سید مسعود حسن رضوی ادیب، سید سرفراز حسین خبیر لکھنوی وغیرہ کے نام شامل کیے گئے تھے[1] لیکن بیخود اور یگانہ کا ساتھ زیادہ دن تک نبھ نہ سکا اور آخر یگانہ، بیخود کے بھی مخالف ہو گئے جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ان معرکوں میں ان کو بیخود کے سپاہی کی حیثیت سے ان کی ہدایتوں پر چلنا گوارا نہ تھا، دوسرا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیخود مرزا غالب کے پرستار تھے اور یگانہ اپنے حریفوں کی ضد میں غالب سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ لکھنوی شاعروں کے ساتھ معرکے میں انہیں محسوس ہوا کہ مرزا غالب کا اثر نہ صرف ان شاعروں پر بلکہ ہمہ گیر ہے لہذا انہوں نے غالب اور غالب پرستوں کو بھی نشانہ بنالیا اور اس زد میں بیخود بھی آ گئے جنہیں انہوں نے "غالب کا دل چٹا"، "مولوی بھٹینگا موہانی" اور "حرصی ٹٹو" کے خطاب دینے کے علاوہ ان سے بھی سخت لفظوں میں یاد کیا۔

یگانہ کی غالب دشمنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی مخالفت جو پہلے لکھنؤ تک محدود تھی اب ہندوستان گیر ہو گئی۔ بعض بہی خواہوں نے انہیں غالب پر حملے کرنے سے روکا بھی لیکن اس سے یگانہ اور مشتعل ہو گئے۔ اپنی رباعیوں کے مجموعے "ترانہ" کے آخر میں انہوں نے غالب کی ہجو میں کچھ رباعیاں شامل کر دیں۔ جب ان کے ایک دوست پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے ان رباعیوں کے شمول کو خلاف مصلحت قرار دیا تو یگانہ نے جواب میں انہیں ایک بہت طویل خط لکھا جس میں غالب پر طرح طرح کے حملے تھے۔ پھر انہوں نے اس خط کو "غالب شکن" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا، پھر اس کو مزید سخت اور مفصل کر کے "غالب شکن دو آتشہ" کے نام سے چھاپا[2] اور غالب کے خلاف کئی اور رباعیاں کہہ کر کتاب میں شامل کر دیں۔ اس سلسلے کی بعض رباعیاں بہت چبھتی ہوئی تھیں اور خاصی مشہور ہوئیں، مثلاً :

تن ڈھکنے کو صاحب کا اُتارن ہے بہت	خاصہ نہ سہی بلا سے اُترن ہے بہت
نوشہ کے لیے خلعت و پنشن ہے بہت	دلی کا تخت الٹ گیا ٹھینگے سے

---

[1] "خطوط بیخود" (بہ نام مسعود حسن رضوی ادیب) مرتبہ سید زائر حسین کاظمی۔ لکھنؤ ۱۹۷۷ء ص۳

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے "میرزا یگانہ" (بہ حوالہ ادیب)

تلوار سے مطلب ہے نہ کھانڈے سے غرض — مومن ہے سروکار نہ ٹانڈے سے غرض
رنگون میں دم توڑتا ہے شاہ ظفرؔ — غالبؔ کو ہے اپنے حلوے مانڈے سے غرض

شہزادے پڑے فرنگیوں کے پالے — مرزا کے گلے میں موتیوں کے مالے
واللہ گریبان میں منہ ڈال کے دیکھ — غالبؔ کو وطن پرست کہنے والے

کیوں کیا ہوئے وہ بہادری کے جوہر — سو پشتوں کی سپہ گری کے جوہر
پنشن کے لیے دلّی سے کلکتے تک — دکھلانے چلے ہو شاعری کے جوہر

غالبؔ کی شاعری پر یگانہ کی تنقید کا خلاصہ انہیں کے لفظوں میں یہ ہے :

"غالبؔ کیا ہے ؟ زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک بلند خیال دقّت پسند شاعر جو بسا اوقات اپنے اوٹ پٹانگ تخیلات کی بھول بھلیاں میں گم ہو جایا کرتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی وہ پرلے سرے کا بے سُرا بھی ہے۔ پرُانا چور اور چور کے ساتھ گونگا بھی ہے۔ مضمون چرانے کو چراتا ہے مگر ہضم نہیں کر سکتا، تصرّف کی قدرت نہیں رکھتا، چوری کھل جاتی ہے۔ زبان ایسی گونگی کہ نفسِ مطلب کو شاعرانہ زبان میں ادا نہیں کر سکتا، ٹھونس ٹھانس کے جُنگ بندی کر لیتا ہے۔"[1]

لکھنؤ کا معرکہ یگانہ نے اپنے خیال میں سر کر لیا تھا، اس لیے کہ صفیؔ، ثاقبؔ اور عزیزؔ کی مقبولیت وقت گذرنے کے ساتھ کم ہو گئی تھی جسے یگانہ اپنا کارنامہ سمجھتے تھے۔ غالبؔ پر اپنی تنقیدوں کا اثر بھی انھوں نے یہ قرار دے لیا کہ اب غالبؔ سے اندھی عقیدت کا دور ختم ہو گیا ہے، لیکن وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ خود انھیں لکھنوی شاعروں بلکہ غالبؔ سے بھی بڑا شاعر تسلیم کر لیا جائے۔ اور اپنی کوشش میں کامیابی کا وہ اپنے آپ کو بھی یقین نہ دلا سکے، ناکامی کے اس احساس نے ان کو اور بھی مشتعل کر دیا اور اب وہ شمشیر برہنہ ہو گئے۔ ابھی وہ اپنے لکھنوی حریفوں کے زوال سے پوری

---

[1] "غالب شکن" (دو آتشہ) آرمی پریس دیال باغ آگرہ ۱۹۳۵ء ص۳

طرح آسودہ بھی نہ ہوئے تھے کہ اردو کی شعری فضا میں کچھ اور نام گونجنے لگے۔ یہ تھے اصغر گونڈوی، فانیؔ بدایونی، حسرتؔ موہانی، جگرؔ مرادآبادی اور جوشؔ ملیح آبادی۔ اور یگانہ کو محسوس ہوا کہ ان کا نام ان ناموں کے پیچھے رہ گیا ہے۔ وہ غصّے سے بے قابو ہو گئے۔ اصغرؔ کو "گنوار گونڈوی عینک فروش"، جگرؔ کو "نابغہ مرادآبادی" اور جوشؔ کو "جوش خان" کا نام دے کر انہوں نے ان شاعروں پر سخت سے سخت حملے کیے۔ ان معاصروں کی شاعری پر اُن کے اعتراضات خالص تنقیدی نقطۂ نظر سے قابلِ غور ہو سکتے تھے لیکن ان کے لہجے کی برافروختگی اور ناشائستگی نے ان کی تنقید کی سنجیدگی اور وزن کو ختم کر دیا، مثلاً جوشؔ کے بارے میں ان کی یہ رائے خاصی نپی تلی ہے :

"وہ زیادہ سے زیادہ جوشیلے، رنگیلے، چٹکیلے، بھڑکیلے الفاظ نظم کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ شعر بن گیا، مگر کم سے کم الفاظ، سادہ، سہل و برجستہ الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معنی پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔"

لیکن جس مضمون میں یگانہ نے یہ رائے ظاہر کی ہے اس کا عنوان انھوں نے "زیٹ زپٹ" رکھا ہے اور اس میں اس طرح کے فقرے بھی ہیں :

"شاعرِ انقلاب کہیں سے سُن بھاگے ہیں کہ قطبِ شمالی میں آفتاب کی حرارت برائے نام تھوڑی دیر تک رہتی ہے، وہاں سردی کے سوا گرمی کا نام نہیں، اس لیے آپ نے لیلیِ حیات کے گیسوئے قطب شمالی کے دامن میں آگ لگا دی۔ شاباش!"

اور اصغرؔ گونڈوی کی شاعرانہ شہرت کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں :

"وہ اک گنوار جاہل شخص جسے شاعری سے کوئی نسبتِ صحیح نہیں، بے کاری کے زمانے چھ مہینے گھر بیٹھا رہا اور اسی چھ مہینے کے "مشغلۂ بے کاری" کے بعد باون گز کا شاعر بن کر نکل آیا اور علی گڑھ کے پھندیت اُسے ایسا لے اڑے کہ دورِ حاضر کے بہترین شعرا میں شمار ہونے لگا۔ اسی کو کہتے ہیں بے پر کی اُڑانا :

دنیائے ادب کی ایسی کایا پلٹی	کالا کوا بھی بن گیا شیرازی
دیکھو تو علی گڑھ کی یہ بالغ نظری	چیل اُڑتے جو دیکھیں تو کہیں بھینس اڑی"

یگانہ کے یہ حملے بھی قریب قریب یک طرفہ رہے۔ کبھی کبھی ان کی تنقیدوں کا جواب

دے دیا جاتا تھا لیکن لکھنؤ میں ان کے پہلے ادبی معرکے نے جو گرما گرمی پیدا کی تھی وہ اب پیدا نہیں ہو رہی تھی اور ان کے تازہ حریفوں کی صف میں کوئی انتشار نظر نہیں آتا تھا۔ یہ صورتِ حال یگانہ کے لیے ناقابلِ برداشت تھی، لیکن ابھی وہ اس معرکے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ زمانہ اور آگے بڑھ گیا اور ترقی پسند تحریک نے ادب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یگانہ اس تحریک پر حملہ آور ہوئے۔ ترقی پسند ادب کو "ادب خبیث" کا نام دے کر انھوں نے فیض، راشد وغیرہ پر برسنا شروع کیا اور یہ رباعی کہی:

قدریں ہی بدل گئیں تو غیرت کیسی	پھر کیوں نہ گدھوں سے ہو حماقت ایسی
سر تو نیچے ہے اور ٹانگیں اوپر	ہت تیرے نئے ادب کی ایسی تیسی

انہیں معرکوں میں یگانہ کی نظر اقبال پر بھی پڑی اور ادبی دنیا میں اُن کا دبدبہ دیکھ کر وہ آگ بگولا ہو گئے، اور اگرچہ "شہرتِ کاذبہ" میں وہ غازی الدین بلجی کے نام سے یہ جملہ لکھ چکے تھے:

"ابو المعانی مرزا یاس، علامہ اقبال اور حضرت اکبر الٰہ آبادی کے کارنامے اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہو کہ شاعری کا مرتبہ کتنا بلند ہو چکا ہے۔"[2]

لیکن اب انھوں نے اقبال کا نام "اکبال" رکھا، اُن کی زبان اور بیان کی تضحیک کی، ان کی تعریف میں لکھے جانے والے فقروں کا مصداق خود کو ٹھہرایا اور ان کے مصرع "یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ" پر یوں تنقید کی:

پنجاب کا وہ جس سے خدا بھی ہارا	ایسا صیاد ہو تو پھر کیا چارہ
یزداں بھی شکار ہو گیا بے چارہ	کیا خوب چڑی مار نے کیا مارا[1]

اس میں شک نہیں کہ یگانہ اپنے بیشتر حریفوں سے زیادہ پڑھے لکھے اور بہتر تنقیدی شعور کے مالک تھے۔ ان کا انگریزی کا مطالعہ بھی اچھا تھا اور ان کی تحریروں میں ملٹن، فریڈرک

---

[1] مکاتیب یگانہ "خطوط مشاہیر بنام سید مسعود حسن رضوی ادیب

[2] ان تحریروں میں وہ مضامین اور خطوط بھی شامل ہیں جو یگانہ نے خود اپنے نام سے لکھے اور "آیاتِ وجدانی" اور "شہرت کاذبہ" کے وہ محاضرات اور تبصرے بھی شامل ہیں جو میرزا مراد بیگ چغتائی اور غازی الدین بلجی کے نام سے لکھے گئے۔ یہ بھی یگانہ ہی کے قلم سے تھے اور وہ اپنے احباب سے اس حقیقت کو چھپاتے بھی نہیں تھے۔ (نیّر مسعود)

رچرڈ، ڈرائڈن، کولرج، شیلے، شیکسپیر، ڈاکٹر جانسن، بیلی، بیکن، ارسطو وغیرہ کے حوالے ملتے ہیں، لیکن ان کی آتش مزاجی، لہجے کی گرمی اور بے محل خودستائیوں نے ان کی تنقیدوں کو متانت سے محروم کر دیا۔ ذیل میں ان تحریروں کے کچھ نمونے دیے جا رہے ہیں جن سے یگانہ کے ادبی مزاج کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ اور تنقیدی نگاہ کے مختلف زاویوں کا اندازہ ہوتا ہے:

حسرت: "آپ نے اپنے مضمون میں مولانا حسرت موہانی کی مدح میں کچھ ویسے ہی مضحکہ خیز غلو سے کام لیا ہے جیسے غالب کی مدح میں تو اس یاختہ بجنوری کی بکواس ... حسرت موہانی سے میں بھی واقف ہوں۔ ایک اوسط درجے کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں جان کتنی؟ بڑا شاعر ہونا تو بڑی بات ہے، حسرت تو حضرت آرزو کو بھی نہیں پہنچتے۔" (آیاتِ وجدانی طبع سوم ص ۱۹۱)

"حسرت موہانی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا، بہت بڑا غزل گو یا رئیس المتغزلین ٹھہرانا ظاہر ہے کہ محض مضحکہ انگیز پروپیگنڈہ ہے۔ ان کی شاعری کچھ ایسی بلند تو ہے نہیں، البتہ بعض غیر شاعرانہ وجوہ کی بنا پر انہیں چمکانے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ کوئی شریف آدمی خواہ کتنا ہی خوش مزاج ہو اور بہت سے حج وج بھی کر چکا ہو، یہ کیا ضروری ہے کہ ان خوبیوں کے پیش نظر وہ اک بڑا شاعر بھی بنا دیا جائے؟" (ایضاً ص ۱۹۴)

فراق گورکھپوری: "یہ دیکھ کر کہ غزل کی اہمیت کا آپ کو کافی اندازہ ہے، میں آپ کی قدر کرتا ہوں، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کر دوں گا کہ محض انگریزی لٹریچر پر اکتفا کر کے (ایرانی لٹریچر سے بے خبر رہ کر) فنِ غزل پر کوئی تبصرہ کرنا "سنسنی خیز" تو ہو سکتا ہے مگر پایۂ اعتبار کو نہیں پہنچتا۔" (ایضاً ص ۱۹۰)

"فنِ شعر و سخن پر کوئی صحیح محاکمہ کرنا آپ کے بس کی بات نہیں کیونکہ آپ کچھ فیشن کی رو میں بہہ بھی جاتے ہیں۔ انگریزی لٹریچر میں آپ کا مطالعہ کتنا ہی وسیع ہو، جب تک آپ ایرانی لٹریچر کے ماسٹر نہ ہوں گے کبھی اردو شاعری پر صحیح محاکمہ نہ کر سکیں گے۔" (ایضاً ص ۱۹۱)

جگر مرادآبادی

اف یہ تیغ آزمائیاں توبہ　　　تیری نازک کلائیاں توبہ
آستینوں کا وہ چڑھا لینا　　　گوری گوری کلائیاں توبہ

گوری گوری کلائیاں توبہ! یہ ہے لکھنؤ کے یکّے تانگے والوں کی شاعری، یکّہ ہانکتے جاتے ہیں اور شعر موزوں کرتے جاتے ہیں۔ یہ خدا کی دین ہے۔" (مضمون "جگر کی شاعری جاپانی مال")

ہجو مے اور پھر جناب جگر　　　پی پلا کر برائیاں توبہ

دوسرا مصرعہ نہایت برجستہ، مگر جگر تو ایک ہی مصرعے کا شاعر ہے، مصرع پر مصرع لگانا آتا نہیں۔" (ایضاً)

"نابغہ (جگر) نے اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھا ہے" مجھے اپنے شعر و ادب پر سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ میری زندگی اور میری شاعری میں بالکل مطابقت ہے، تضاد نہیں"۔ اس بلند آہنگی سے اس شخص کی شہرتِ عامّہ کے سبب لوگ دھوکا کھا جائیں تو عجب نہیں، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ زندگی اور شاعری میں "بالکل مطابقت" قابلِ فخر جب ہی ہو سکتی ہے کہ خود اپنا طرزِ زندگی کوئی قابلِ فخر اہمیت رکھتا ہو۔ محض لاابالی زندگی (جس کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں نہ ہوں) اور شاعری میں بالکل مطابقت ہوئی بھی تو کیا۔ اور یہ ممکن ہی نہیں کہ شاعری اور اس کی زندگی میں "بالکل مطابقت" ہو سکے، کیونکہ وہ آپ بیتی بھی کہتا ہے اور جگ بیتی بھی... لاابالی زندگی کی اہمیت ہی کیا؟ اک مطلق العنان غیر ذمہ دارانہ زندگی کے ساتھ کسی نے اپنی شاعری کو" بالکل مطابق" بنا بھی لیا تو یہ کون سا کمال ہے:

ایں متاع ست کہ ہر بے سر و پائے دارد" (مکتوب یگانہ بہ نام فراق)

جوش ملیح آبادی: "میں آج سے بہت پہلے کسی موقعے پر کہہ چکا ہوں کہ جوش کا کلام پرکھنے کے قابل ہی نہیں۔ محض الفاظ کی بے معنی نمائش ہوتی ہے، مگر میں نے ان

کی سچی باغیانہ شاعری کے خلاف کبھی ایسا حکم نہیں لگایا۔ مذہب، معاشرت اور سیاست کے خلاف جوشؔ کی باغیانہ نظمیں ان کی شاعرانہ قابلیت اور قومی خدمت کا روشن ثبوت ہیں، البتہ شعروادب کو آرٹ کی حیثیت سے اور ہندوستان کی نسوانی عظمت کو اخلاقی حیثیت سے ان کی نظم بازیوں نے بڑا نقصان پہنچایا۔ جو قابلِ افسوس ہے۔ لکھنؤ کی رعایتِ لفظی کم ازکم الفاظ کا ایک کھیل تو تھی۔ کچھ نہ کچھ معنوی تعلق کی خاطر رعایتِ لفظی کا کھیل کھیلا جاتا تھا، اور وہ کھیل اک کھلاڑی کا ہوتا تھا، اناڑی کا پھوہڑ پن نہ تھا۔ مگر جوشؔ کے ہاں وہ کھیل بھی نہیں ہوتا، بے ضرورت ٹھونس ٹھانس ہوتی ہے، محض نمائش کے لیے، وہ بھی بے ہنری کے ساتھ"

(جوشؔ کی نظم "دخترانِ حوّا کا کورس" پر تنقید)

"جوشؔ کی عادت ہے کہ وہ شاندار بھاری بھرکم فینسی الفاظ معنی ومفہوم میں اضافے کے لیے نہیں محض دکھاوے کے لیے استعمال کیا کرتے ہیں جنہیں عبارت سے کوئی معنوی تعلق نہیں ہوتا۔" (مضمون "زیٹ زہرٹ")

ترقی پسند ادب : " نئے اسلوب کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو :

بادِ صبا کے ہلکوروں میں تند ہوا تبدیل ہوئی
پھول کھلے (یہ گویا دوسرا مصرعہ ہے، تھو)
مستی چھائی (یہ گویا تیسرا مصرعہ ہے، تھو)
مرجھا گئے کنول شاداب ہوئے
میں ہوں بے دل
مایوس
ایک
بچارا

یہ سب گویا آٹھ مصرعے ہیں۔ انہیں تلے اوپر لکھ کر ایک بند قرار دیا گیا ہے اور گویا اک گاؤدُم سی شکل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ گویا شاعری کا اسلوب

بدل رہا ہے! تھو" (مضمون" ادب خبیث")

فیض احمد فیض: خدا جانے فیض کون صاحب ہیں، مگر "ترقی پسند" ہیں۔ دیکھئے "یوں" شاعری" فرماتے ہیں:

(۱) بول کہ لب آزاد ہیں تیرے (۲) بول زباں اب تک تیری ہے (۳) بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے (۴) بول کہ سچ زندہ ہے اب تک (۵) بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے بول بول ارے بول بول جی ہاں، یہ ہے گویا شاعری اور ترقی پسند شاعری نہ تال کی نہ سم کی نہ سُر کی۔ دیکھئے خبردار اسے نثر نہ سمجھئے۔ یہی تو انقلابی شاعری ہے۔ اسی میں تو ملک کی ترقی کا راز پنہاں ہے۔ تھو!

کیا واقعی یہ کوئی سنجیدہ فعل ہے یا تمسخر۔ کیا واقعی کوئی باحواس آدمی نیک نیتی کے ساتھ ان ٹوٹے پھوٹے بولوں کو سچ مچ شعر کی حیثیت سے پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ یہ تو ایسے اکھڑے اکھڑے بول ہیں کہ نثر کی حیثیت سے بھی کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ کیا کوئی نیچے درجے کا طالب علم اس قسم کے بولوں پر سو میں پانچ نمبر بھی پا سکتا ہے؟ کیا ان میں پھوہڑپن کے سوا کوئی ادبی سلیقہ پایا جاتا ہے؟" (ایضاً)

اقبال: "سیماب صاحب کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال کے بعد پنجاب کا ادب آوارہ ہو گیا۔ مگر ڈاکٹر اقبال کے بعد کیا معنی؟ ان کے انتقال کو چھ سات سال ہو گئے ہیں۔ آوارگی و گمراہی تو ان کی زندگی ہی پھیل چکی تھی اور انہیں کی بے توجہی سے بڑھتی گئی۔ انہوں نے کوئی بزرگانہ ہدایت، کوئی روک تھام نہیں کی۔ اقبال کو ادبِ اردو کی کوئی ایسی پروا تو تھی نہیں۔ دیکھا دیکھی ان کی امت بھی بے پروا و مطلق العنان ہو گئی۔ ان کا مرکز توجہ تو حجاز تھا، ہندوستان سے محبت کیوں ہوتی؟

ادبِ اردو کی نگہداشت ڈاکٹر اقبال کا مقصدِ زندگی تھا ہی نہیں۔ وہ تو اک مذہبی اور سیاسی آدمی تھے۔ اسی میں وہ پڑے رہے۔ اردو شاعری

کے لیے جس باقاعدہ اکتسابِ فن کی ضرورت ہے اس کی طرف سے چشم پوشی کر کے گمراہی کا بیج تو ڈاکٹر اقبال ہی بو گئے۔ ان کی بے پروائی سے نااہلوں کی جراتیں بڑھتی گئیں۔ ادب کے اصول و ضوابط توڑ پھوڑ کر بدنظمی پھیلا دی گئی۔ یہ نتیجہ ہوا جدید نظم بازی کا۔" (ایضاً)

یگانہ: "مغروروں کے مقابل میرزا یگانہ کا غرور مسلّم سہی مگر کسی سچے اور حقیقی شعر کے مقابل مرزا صاحب نے کبھی اپنے تئیں مغرور نہیں پایا خواہ وہ کسی کا شعر ہو۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ بھوپال میں بہزاد لکھنوی کی زبان سے یہ شعر سن کر:

آ مری کائناتِ دل، میری بہارِ زندگی   آ کہ میں یہ نہ کہہ سکوں مجھ کو خدا نہ مل سکا

دیر تک روتے رہے۔ طبعی جنگ جوئی کے ساتھ دل میں اتنا سوز و گداز بھی ودیعت ہوا ہے۔ اسی طرح وہ جگر مرادآبادی کو جیسا کچھ سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں مگر سچے شعر کے ساتھ کبھی بے انصافی نہیں کی۔ جگر کا یہ شعر اکثر مرزا صاحب کو تڑپاتا رہتا ہے:

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر   جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں"

(آیات طبع سوم ص ۲۸)

"واضح رہے کہ یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے حضرت نیاز کی تائید تو ہوتی ہے، اور یہ محض اس وجہ سے کہ میں نے ان کے اعتراضات کو صحیح سمجھا، مگر جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ کبھی مجھ پر نیاز صاحب کی جنبہ داری کا شبہ نہیں کر سکتے۔ مجھ سے نیاز صاحب کے کوئی خاص تعلقات نہیں اور جو کچھ تعلق ہے بھی وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے برعکس میرے اور جوش کے ذاتی تعلقات خوش گوار ہیں اور رہیں گے، مگر ان خوش گوار تعلقات کا اثر شعر و ادب پر نہیں پڑ سکتا...... اتنا کہہ جانے کے بعد بھی کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور کی نظمیات کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں جس میں پنجاب اور دکن بھی شامل ہے، جوش کی ٹکر کا ناظم کوئی

نہیں۔ اب رہا شعر، تو یاد رکھیے حقیقی شعر کے میدان ہیں

"غالبؔ کے چچا کے آگے سب ڈھینڈس ہیں"[1] ("دخترانِ عوا کا کورس" پر تنقید)

"سچ تو یہ ہے کہ اس صدی میں یگانہؔ کے سوا اور کسی کو شاعر سمجھنا محض خود فریبی ہے۔"

(آیات طبع سوم ص۸۸)[2]

آخر یگانہؔ لڑتے لڑتے بوڑھے ہو گئے اور اب ان کے زیادہ تر حملے خالی جانے لگے۔ اپنی تنقیدوں کے ردّ عمل میں جس عام اشتعال کی انہیں تمنّا تھی وہ پیدا نہیں ہو رہا تھا اور زمانہ انہیں فراموش کرنے پر تلا ہوا تھا۔ تب، عمر کے آخری دور میں، انہوں نے اپنے قلم کا رُخ ایک نئی سمت پھیر دیا۔ پہلے انہوں نے ایک کتاب لکھی جس کے متعلق قاضی عبد الودود کا بیان ہے:

"تخلیقی ادب[3] جلد ۲ کراچی میں "میرزا یگانہؔ شخصیت اور فن" نام کی ایک کتاب شامل ہے۔ بہت کچھ ہے لیکن یہ نہیں کہ انہوں نے ایک ضخیم کتاب اسلام کے خلاف لکھی تھی۔ یہ دوارکا داس (شعلہ) کے پاس ہے۔ اس کی وصیّت تھی کہ اوکسفرڈ بھیج دی جائے تاکہ وہاں اس کا ترجمہ شائع ہو، مگر شعلہؔ نے وصیّت پر عمل چند سال قبل تک تو نہیں کیا تھا، بعد کا حال معلوم نہیں[4] لچر سی کتاب تھی۔"

یگانہؔ پر اپنے مضمون "یہ تیس برس کا قصہ[5] ہے" میں شعلہؔ نے اس کتاب کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، لیکن شعلہؔ کے نام یگانہؔ کے خطوط[6] کے مندرجہ ذیل فقرے بہ ظاہر اسی کتاب (یا کتابوں) سے

---

[1] یہ یگانہ کی اس رباعی کا چوتھا مصرع ہے:

شاعر تو ہیں بہتیرے مگر پھسپھس ہیں، | کچھ ان میں خام جوش کچھ کرکس ہیں
غالبؔ غالب ارے کہاں کے غالبؔ | غالبؔ کے چچا کے آگے سب ڈھینڈس ہیں

[2] مرتبہ مشفق خواجہ۔ ناشر عصری مطبوعات، کراچی ۱۹۸۰ء

[3] مکتوبِ قاضی عبد الودود بہ نام نیر مسعود۔ مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۸۱ء / ۱۰ فروری ۱۹۸۲ء (مرقومہ بالا عبارت ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

[4،۳] مشمولۂ تخلیقی ادب ۲ ص۳ مطبوعہ نقل میں اس جگہ نقطے لگا دیے گئے ہیں۔ غالباً یہاں پر لفظ "مسلمان" ہوگا۔ (نیر مسعود)

متعلق ہیں، اگرچہ شعلہ نے حواشی میں اس کی وضاحت نہیں کی ہے :

۱۔ "میرا Oxford کہاں ہے، کس حالت میں ہے"؟ ص ۵۲۳

۲۔ "میرے مسودات اب یورپ بھیج دو، یا کوئی تجویز پیش کرنا چاہو تو کرو"۔ ص ۵۲۳

۳۔ یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ تمہیں MSS کی نقل نہ رکھنے کی بھی فکر ہے، ہاں یہی ہونا چاہئے۔ مگر اس کے متعلق میں اتنا ضرور کہوں گا کہ جس سے نقل کراؤ اپنے سامنے بٹھا کر نقل کراؤ۔ یہ کاغذات اُسی کے حوالے نہ کر دیکیونکہ یہ کاغذات ایسے تو ہیں نہیں، اور جس کو دو چار صفحے سے زیادہ نہ دو۔ پورا مسودہ ہرگز نہ دو۔ چار پانچ جو ایک نشست میں نقل ہو سکیں اتنے ہی دو۔ اب دوسری بات یہ ہے کہ نقل کرنے والا ایسا ہو جو صحیح نقل کر سکے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی ...... سے یہ کام نہیں لیا جا سکتا۔ میرے خیال میں بشیشر پرشاد منوّر لکھنوی کو ہموار کر کے اُن سے یہ کام لے سکو تو لے لو۔ میں جانتا ہوں وہ میرے ہمدرد ہیں، بہی خواہ ہیں، مگر یہ فقط میرا اک خیال ہے۔ کام تو تمہیں اپنی رائے پر کرنا ہے، اپنے بھروسے کے آدمی سے کام لینا۔ نقل میں کچھ غلطی رہ جائے گی تو اسے میں درست کر دوں گا۔ الغرض ان مسودات کو یورپ بھیجنا ضرور ہے"۔ ص ۲۵-۵۲۴

۴۔ "معلوم نہیں میرے مسودات کہاں ہیں۔ اب انہیں جلد بھیج دو اور مجھے اطلاع دو۔ اپنے پاس رکھنا ہرگز مناسب نہیں ہے"۔ (ص ۵۲۶)

۵۔ "میرے مسوّدات کی نقل لینے کی جو کوشش تم نے کی، امید ہے اب یہ کام انجام پا جائے گا"۔ (ص ۵۲۶)

۶۔ "پڑھ کر اطمینان ہوا کہ مسودات کے بارے میں تم ضروری تدبیریں کر رہے ہو"۔ (ص ۵۲۶)

اسی کے ساتھ یگانہ نے پیغمبر اسلامؐ کی طرف رخ کیا۔ بہت پہلے وہ انہیں اپنا "استادِ اعظم" لکھ چکے تھے اور ایک ایسی نعت بھی کہہ چکے تھے جو اردو کی بہترین نعتوں میں شمار ہونے کے لائق ہے :

اے آئینۂ انوارِ ازل　　اے جلوہ گہہِ ہر حسنِ عمل
ہے دیر سے ٹھنڈا دل کا کنول　　دیدار دکھا پردے سے نکل

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

جانِ جہاں مقصودِ دو عالم　　فرش نشیں اور عرش کا محرم
اشرفِ انساں افضلِ آدم　　خاک کا پتلا نورِ مجسّم

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

آشفتہ بیانی سُن تو سہی　　کچھ دردِ نہانی سُن تو سہی
ہاں میری زبانی سُن تو سہی　　یہ رام کہانی سُن تو سہی

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

دیوانہ ہوں لیکن مستِ وِلا　　گم گشتۂ منزل سہو و خطا
کچھ دھیان نہ کر جو ہوا سو ہوا　　گمراہ کو شمعِ جمال دکھا

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

اب اسی ہستی کی شان کے خلاف یگانہ نے کچھ رباعیاں کہیں۔ لیکن اپنے ادبی معرکوں کو مذہبی معرکے میں تبدیل کرنے کی یہ کوشش انھیں راس نہ آئی۔ ان رباعیوں کے ردِ عمل میں سخت اشتعال پیدا ہوا اور لکھنؤ میں ۱۳ مارچ ۱۹۵۳ء کو بڑی رسوائی کے ساتھ ان کا جلوس نکالا گیا جس کے تین سال کے اندر ۴ فروری ۱۹۵۶ء کو ان کی وفات ہوگئی۔ اس طرح یہ آخری معرکہ اسی مرحلے میں ختم ہوگیا، حالانکہ یگانہ نے اور مرحلوں کی بھی تیاری کرلی تھی۔ اسلام کے خلاف ان کی کتاب کے متعلق جن خطوں کے اقتباس اوپر دئے گئے ہیں وہ سب خط جلوسِ رسوائی کے بعد لکھے گئے تھے۔ علاوہ بریں ان کے سامان میں سے قرآن مجید کا ایک نسخہ برآمد ہوا تھا جس کے حاشیوں پر انھوں نے اس کے اسلوب اور معانی پر اپنے اعتراضات نوٹ کئے تھے اور اس صحیفۂ آسمانی کے خالق کے ساتھ بھی قریب قریب ویسا ہی لہجہ اختیار کیا تھا جیسا "صحیفۂ وِلا" کے مصنف عزیز لکھنوی کے ساتھ اختیار کر چکے تھے۔

یگانہ کی چند غیر معروف تحریریں

یگانہ کی جن تحریروں کا تعارف مقصود ہے وہ ماہنامہ "نظارہ" میرٹھ کے دسمبر ۱۹۱۵ء سے ستمبر، اکتوبر ۱۹۱۶ء تک کے شماروں میں شائع ہوئی تھیں۔ "نظارہ" محمد عبدالحمید حمید میرٹھی (علیگ) کی ادارت میں نومبر ۱۹۱۵ء سے شائع ہونا شروع ہوا اور یگانہ پہلے ہی شمارے سے اس کے قلمی معاونوں میں شامل ہو گئے تھے۔ پہلے شمارے میں اُن کی آٹھ رباعیاں چھپیں جن پر ایڈیٹر کا مندرجۂ ذیل نوٹ ہے :

"مرزا واجد حسین یاسؔ عظیم آبادی ممتاز شعرا میں سے ہیں اور آپ کو اس فن میں مہارت تامہ حاصل ہے۔ ہمیں اکثر آپ کا کلام دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ غزل گوئی میں آپ حضرتِ آتشؔ مغفور کے پیرو ہیں۔ علاوہ اس کے آپ کا کلام فلسفیانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مضامین میں جدّت پائی جاتی ہے۔ یہ رباعیاں آپ نے اخلاقی رنگ میں تحریر فرمائی ہیں۔ ہم نہایت شکریے کے ساتھ درج کرتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ حضرت یاسؔ اسی طرح "نظارہ" کو رونق بخشتے رہیں گے۔"

"نظارہ" کے پیشِ نظر شمارے یگانہ ہی کی مِلکؔ[1] تھے اور ان پر کہیں کہیں یگانہ کے قلم کی تحریریں بھی ہیں۔ ان قلمی تحریروں میں سب سے دل چسپ چیز محمد یوسف جعفری رنجورؔ عظیم آبادی کی نظم "ہماری حالتِ زار" کے ابتدائی پانچ شعروں کا منظوم فارسی ترجمہ ہے جو یگانہ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے "یگانہ" (بہ حوالہ ادیب)

نے ان شعروں کے اوپر لکھ دیا ہے۔ رنجور کے شعر اور ان کے ترجمے درج ذیل ہیں

شعر: منزل پہ پہنچنے میں کیونکر نہ ہو دشواری — لنگ اسپِ عمل اس پر عصیاں کی گراں باری
ترجمہ: رسیدن تا سرِ منزل چرا باشد نہ دشواری — کہ ہم اسپِ عمل لنگ و ہم از عصیاں گراں باری

شعر: سن پائی جو ہے اس نے مولا تری غفاری — بے غم ہے عقوبت سے عاصی کی گنہگاری
ترجمہ: ازاں وقتے کہ گوشش یافت در شانت زغفاری — نہ کرد ایچ عاصیے فکرِ عقوبت بر گنہگاری

شعر: یا کرتے تھے ہم پہلے اعدا سے ملنساری — یا ہم کو ہے آج اپنے احباب سے بیزاری
چناں ہم بود با اعدائے خود کردیم غم خواری — چناں ہم ہست از احباب ہم داریم بیزاری

شعر: کب کوئی عمل اپنا اخلاص پہ مبنی ہے — کب کوئی عبادت ہے خالی زریاکاری
ترجمہ: عمل یک نیست از ما کاندراں اخلاص می باشد — عبادت ہیچ از ما نیست خالی از ریاکاری

شعر: ہے دین کے پردے میں شہرت طلبی پنہاں — کس کام کی ہے اپنی یہ نام کی دیں داری
ترجمہ: نہاں در پردۂ دیں شہرت و نام آوری خواہی — نہادندے ہمیں بے سودشے را نام دیں داری

"نظارہ" کے ان شماروں میں شامل یگانہ کی مطبوعہ نثری تحریروں کی فہرست یہ ہے:

۱ ۔ فلسفۂ ہمدردی (دسمبر ۱۹۱۵ء)
۲ ۔ مسئلۂ انتقام (جنوری ۱۹۱۶ء)
۳ ۔ بعض شعرائے عظیم آباد (فروری ۱۹۱۶ء)
۴ ۔ الفاظِ مہندبہ عطف و اضافت (اپریل مئی ۱۹۱۶ء)

۵	۔	مسرت ہمدردی	(جون ۱۹۱۶ء)
۶	۔	رسم و رواج کا اثر	(جولائی ۱۹۱۶ء)
۷	۔	تمام شعرائے حال کی خدمت میں اپیل	(جولائی ۱۹۱۶ء)
۸	۔	کلام آتش بہ رنگ صائب	(ستمبر، اکتوبر ۱۹۱۶ء)

ذیل میں (قدرے بدلی ہوئی ترتیب کے ساتھ) ان تحریروں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے:

بعض شعرائے عظیم آباد

(فروری ۱۹۱۶ء ص ۵۴ تا ۶۱)

یہ عظیم آباد کے مندرجۂ ذیل فارسی کو شاعروں کا تذکرہ ہے:

۱۔ آشنا (شاہ ابوتراب) ۲۔ امین (محمد امین اللہ) ۳۔ الفت (لالہ اجاگر چند) ۴۔ الفتی (راجا پیارے لال) ۵۔ بیخود (کشمیری، شاہجہان آبادی ثم عظیم آبادی) ۶۔ بیخود (شیخ محمد دائم ۷۔ بیدل (میرزا عبدالقادر) ۸۔ بے ریا (کرم علی) ۹۔ تحقیق (میر محمد عظیم) ۱۰۔ جودت (سید حبیب الرحمٰن) ۱۱۔ حسرت (محمد سعید) ۱۲۔ حسرتی (لالہ بندا پرشاد) ۱۳۔ حسن (سید شاہ غلام حسن) ۱۴۔ خلیق (کرامت اللہ خاں) ۱۵۔ رنگین (منشی بلاس رائے) ۱۶۔ شاکر (میر یحییٰ) ۱۷۔ شرف (محمد شرف الدین پھلواری) ۱۸۔ صولت (سید محبوب شیر) ۱۹۔ ضمیر (کنور ہیرالال) ۲۰۔ عاصی (محمد علی خاں) ۲۱۔ عاشق (مہاراجا کلیان سنگھ) ۲۲۔ عاشقی (نواب حسین قلی خاں) ۲۳۔ عبرتی (میر وزیر علی) ۲۴۔ عشقی (شیخ محمد وجیہ الدین) ۲۵۔ فرحت (خواجہ فیض اللہ معروف بہ شاہ غلام مخدوم عظیم آبادی) ۲۶۔ فرد (سید شاہ محمد ابوالحسن پھلواروی) ۲۷۔ فرقتی (سید علی بخش ملقب بہ سید امیر خاں) ۲۸۔ فریاد (شاہ الفت حسین) ۲۹۔ قدرت (شاہ قدرت اللہ عظیم آبادی) ۳۰۔ قصیر (امیر اللہ عظیم آبادی) ۳۱۔ گشتہ (میرزا محمد علی خاں عظیم آبادی) ۳۲۔ مضمون (میر محمد ہاشم عظیم آبادی) ۳۳۔ وحشتی (شاہ بخشش حسین) ۳۴۔ یاس (انور علی آروی) ۳۵۔ یکتا (مرزا نورد زعلی خاں)۔

شاعروں کے تذکرے سے پہلے مختصراً عظیم آباد کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس تمہیدی حصے سے کچھ معلومات یگانہ کے بارے میں بھی حاصل ہوتی ہے، مثلاً :

"اوائل میں دہلی کی زبان اور آخر میں لکھنؤ کی زبان کی تقلید عظیم آباد میں ہوئی (چنانچہ کمترین یاس کے دادیہالی بزرگوں کی زبان دلی کی زبان تھی۔ اور ننہالی بزرگوں کی زبان لکھنؤ کی کیونکہ ننہالی سلسلہ لکھنؤ سے تھا)"

"کمترین یاس بھی اسی محلہ مغل پورہ کی خاک ہے جہاں سے بالمرہ شام کے وقت خاندانِ دہلی و لکھنؤ کے شہزادوں کے ڈیڑھ سو ہوادار چوک کی سیر کو نکلتے تھے۔ اس مغل پورہ کی حالت لکھنؤ کے محلہ مفتی گنج کی سی تھی جہاں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے شرفا بھی تھے اور ایک سے ایک نامی بانکے بھی موجود تھے۔"

شاعروں کے احوال کے سلسلے میں یگانہ لکھتے ہیں :

"اب .... عظیم آباد کے چند شعرا کا حال لکھتا ہوں جن کا ذکر تذکروں میں موجود ہے، مگر پہلے فارسی گویوں سے شروع کرتا ہوں۔ بعد کو اردو گویوں کا حال لکھوں گا۔"

یہ حالات بیشتر فارسی شاعروں کے تذکروں سے منقول اور فارسی زبان میں ہیں، البتہ کہیں کہیں یگانہ نے اردو میں کچھ اضافے کیے ہیں، مثلاً سید حبیب الرحمٰن جودت کا حال تذکرۂ "روز روشن" سے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

"کم ترین یاس نے جناب موصوف کو دیکھا ہے۔ دس بارہ برس اُدھر حضرت کا دیوان بھی میری نظر سے گذرا تھا .... افسوس ہے کہ اس وقت دیوان موجود نہیں ہے۔ ہاں اُن کے صاحب زادے یعنی میرے مکرم دوست جناب سید ظہور الدین صاحب عظیم آبادی نے کچھ کلام لکھ بھیجا ہے، وہ درج کیے دیتا ہوں اور ایک مطلع بھی اُن جناب کا مجھے اب تک یاد ہے۔"

حسین قلی خاں عاشقی (مولفِ تذکرۂ "نشترِ عشق") کے ذکر میں لکھتے ہیں :

"افسوس ہے کہ نہ اس وقت تذکرۂ نشترِ عشق میرے پاس موجود ہے نہ

جناب ممدوح کا کچھ کلام موجود ہے۔ ان کے پوتے جناب تقی نواب صاحب مرحوم ساکن کشمیری کوٹھی عظیم آباد کے ہاں میں بہت دن ملازم رہ چکا ہوں۔ اُن کے صاحب زادوں کو میں پڑھاتا تھا۔ افسوس ہے کہ اس خاندان کے لوگ اس وقت موجود تو ہیں مگر تباہی میں پڑ گئے ہیں"

مرزا نوروز علی خاں یکتاؔ کے حال کے آخر میں:

"راجا پیارے لال الفتیؔ کے مشاعروں میں حضرت استاذی جناب خان بہادر رشاؔد مدظلہٗ نے مرزا نوروز علی خاں یکتاؔ سے اکثر دادِ سخن لی ہے۔ دیوان محلہ میں حضرتِ یکتاؔ کا مکان تھا"

محمد سعید حسرتؔ کے ذکر میں:

"مولانائے موصوف مولانا کشفیؔ کان پوری کے شاگرد رشید تھے۔ کم ترین یاسؔ کے جدِّ امجد مرزا احمد علی صاحب مرحوم اور مولانائے موصوف سے بے حد خلوص اور ربط تھا، اور دونوں ایک ہی محلّے (مغل پورہ) کے رہنے والے تھے۔ مجھ سے اور ان بزرگواروں سے خاندانی ارتباط ہے۔ مولانائے موصوف کے نواسے جناب مولوی شاہ سید نذر الرحمٰن صاحب حفیظؔ عظیم آبادی کم ترین پر شفقتِ بزرگانہ فرماتے ہیں۔ مولانا حسرتؔ کا سنہ ولادت ۱۲۳۱ھ، سنہ وفات ۱۳۰۴ھ ہے"

نمونۂ کلام کے جو شعر یگانہ نے درج کیے ہیں ان میں بعض مصرعوں کی ناموزونی کی طرف ایڈیٹر نے حاشیوں میں اشارے کیے ہیں۔ ان حاشیوں کے نیچے یگانہ نے اپنے قلم سے تصحیحی نوٹ لکھ دیے ہیں، مثلاً مصرع:

چراغے کردہ ام کہ در ہر خانہ می سوزد

پر ایڈیٹر کا حاشیہ ہے:

"اس مصرعے میں کوئی لفظ رہ گیا ہے، مگر مسودے میں اسی طرح ہے۔ مجبوراً درج کیا گیا" (ایڈیٹر)

اس کے نیچے یگانہ نے لکھ دیا ہے :

"لفظِ "روشن" رہ گیا۔ یاسؔ"

مضمون کی دوسری قسط، جس میں عظیم آباد کے اردو شاعروں کا تذکرہ ہونا تھا، "نظارہ" کے پیشِ نظر شماروں میں شائع نہیں ہوئی۔

۲۔ فلسفہ ہمدردی

(دسمبر ۱۹۱۵ء ص ۲۵ تا ۲۷)

اس مضمون میں یگانہ نے ہمدردی کو ایک جذبہ قرار دے کر اس کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس جذبے کا وفور یا کمی انسان میں تصوّر اور احساس کی قوتوں اور اس کے سابقہ تجربوں پر منحصر ہے۔ مضمون کے چند اقتباس حسب ذیل ہیں :

"کسی کے دکھ درد کا احساس کوئی غیر شخص اُس حد تک نہیں کر سکتا جتنا وہ خود کر سکتا ہے۔ ہاں تصوّر سے کام لے اور سوچے کہ ہم اس مصیبت میں مبتلا ہوتے تو ہم پر کیا گذرتی، اس طور پر کسی کی مصیبت کا اندازہ، ایک حد تک ہو سکتا ہے۔ فرض کیجئے کوئی شخص اپنے بیٹے کو آگ میں جلتے دیکھ رہا ہے۔ اس تکلیف کو باپ اس حد تک محسوس نہیں کر سکتا جس حد تک بیٹا محسوس کر رہا ہے۔ باپ کو پیشتر اگر آگ میں جلنے کا اتفاق ہو چکا ہے تو البتہ اس آگ کی تیزی کا اندازہ تصوّر کے ذریعے کر سکتا ہے۔ یعنی اپنے سابق کے تجربے پر اس تکلیف کو ذہن میں سمجھ سکتا ہے، مگر اس تکلیف کو محسوس نہیں کر سکتا۔ محسوس جب ہی کر سکتا ہے کہ خود بھی آگ میں کود پڑے۔"

"تصورِ صادق دوسروں کی مصیبت کی تصویر کھینچ کر ہمارے جذبات کو برانگیختہ کر دیتا ہے اور ہم ان کی مصیبتوں کو اپنی مصیبت سمجھ کر کانپ اٹھتے ہیں، مگر یہ اندازۂ مصیبت محض اپنے احساس و تصور کی تیزی پر منحصر ہے۔ . . . گویا بنائے

ہمدردی محض ادراک و احساس کی تیزی پر قائم ہے۔"

"اکثر مشاہدہ کیا گیا ہے کہ جب کوئی نٹ دو بانس گاڑ کر اور اس میں ایک رسّی باندھ کر اور اُس رسّی پر کوئی تھالی رکھ کر اپنے گھٹنوں کے بل تھالی پر کھڑا ہوتا ہے اور اپنے جسم کو قابو میں رکھ کر خود کو سنبھالتا ہے یعنی کششِ ارضی کا اثر ہونے نہیں دیتا تو بعض تماشائی بھی خود کو اُسی نٹ کی طرح سنبھالتے ہیں۔ سمٹ سمٹ کر اپنے بدن کو چراتے ہیں گویا وہی حالت اُن پر بھی طاری ہوتی ہے۔ آخر یہ کیا بات ہے؟ وہی تیزیِ احساس، دوسرے کی حالت کا اثر لینا۔"

"فلسفۂ ہمدردی کے متعلق ایک نکتہ اور بھی قابلِ غور ہے۔ کسی مصیبت یا کسی ذلّت کا احساس جو کسی شخص پر ہوتا ہے وہ محض اپنے نقطۂ خیال سے ہوتا ہے، یعنی دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم ایسی حالت میں گرفتار ہو جاتے تو ہم پر کیا اثر ہوتا، عام اس سے کہ جو شخص اس وقت مبتلائے مصیبت ہے اس پر کچھ اس کا اثر ہے بھی یا نہیں۔ مثلاً ہم کسی کو بھیک مانگتے، ٹھوکریں کھاتے دیکھتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ خدانخواستہ ہم پر بھی مصیبت پڑتی تو اپنا کیا حال ہوتا، حالاں کہ ان بھیک مانگنے والوں پر خود اپنی حالتِ سقیم کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا دیکھنے والوں پر ہوتا ہے۔ بھیک مانگنے والے اپنی اسی حالت میں مست ہیں، مگر ذکی الحس طبیعتیں اس کا بہت اثر لیتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کسی کی مصیبت یا ذلّت کا اندازہ کرنا اثر پذیر طبیعتوں پر منحصر ہے۔"

۳۔ مسرّتِ ہمدردی

(جون ۱۹۱۶ء ص ۱۶۸ تا ۱۷۰)

اس مضمون کو "فلسفۂ ہمدردی" کی توسیع سمجھنا چاہیے۔ ضمناً اس مضمون میں ہمدردی کی ماہیت زیرِ بحث آئی ہے لیکن اس کا اصل موضوع جانبین پر ہمدردی کا خوشگوار ردِّعمل ہے۔

چند اقتباس دیکھیے:

"انسان جب کسی کو اپنے جذبات کا شریکِ حال پاتا ہے تو دل میں خود بہ خود ایک راحت سی محسوس ہوتی ہے اور جب کسی کو اپنے جذبات سے مخالف دیکھتا ہے تو آپ سے آپ ایک تکلیف محسوس ہوتی ہے... جب کوئی شاعر کسی صحبت میں اپنا کچھ کلام پڑھتا ہے اور سامعین کو اپنی طرف متوجہ نہیں دیکھتا ہے تو ایک قسم کا اثرِ مخالفت محسوس کرتا ہے۔ اگر سامعین اس کے جذبات کے شریک حال ہوتے تو اسے کچھ مسرت ہوتی...... کسی کے جذبات کا شریکِ حال ہونا ہمدردی ہے خواہ وہ جذبات کسی قسم کے ہوں"

"کوئی شاعر جب اپنی ایک غزل کو بار بار پڑھ چکتا ہے تو پھر اس کے دل پر اپنی غزل کا وہ اثر باقی نہیں رہتا۔ مگر وہی غزل جب کسی نئے شخص کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو اُس پر تازہ اثر کرتی ہے اور اُس نئے شخص کو متاثر دیکھ کر شاعر کو بھی تازہ لطف حاصل ہوتا ہے.... گویا سامع نے اس غزل کے ساتھ ہمدردی کر کے شاعر کے مردہ جذبات کو ازسرِ نو زندہ کر دیا اور مسرتِ تازہ بخشی"

"جب انسان میں کوئی خاص جذبہ کسی وقت موج زن ہوتا ہے تو اظہار ہمدردی کی بدولت اس میں اور بھی تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ یہ کلیّہ ہے۔ مگر یہاں پر ایک سوال یہ ہے کہ جب اظہار ہمدردی کسی جذبۂ خاص کو اور بھی انگیختہ کر دیتا ہے تو اس کلیّے کے مطابق کسی مصیبت زدہ کے ساتھ ہمدردی کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ اس کے رنج و غم اور بھی زیادہ ہو جاتے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا بلکہ بجائے اشتعال ایک قسم کا سکون پیدا ہوتا ہے۔ پروفیسر Adam Smith نے اس شبہے کو نہایت خوبی سے رفع کر دیا ہے۔ کہتے ہیں:

"Sympathy enlivens joy and alleviates grief"

یعنی ہمدردی خوشیوں کو بڑھاتی ہے اور رنج وغم کو گھٹاتی ہے۔"

جس طرح کو کسی واقعے کے متعلق ہم لوگوں کے اظہارِ ہمدردی سے خوش ہوتا ہے اور عدمِ ہمدردی سے آزردہ ہوتا ہے اُسی طرح ہم بھی (اُس کے شریکِ حال وہمدرد بن کر) خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر کسی مجبوری کے سبب ہم اس کے شریکِ حال نہیں ہو سکتے، ہمدردی نہیں کر سکتے (حالانکہ دل چاہتا ہے)، تو ہم کو بھی بجائے خود ایک اندرونی صدمہ پہنچتا ہے ..... اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمدردی جانبین کے لیے باعثِ مسرت ہے۔"

۴۔ مسئلۂ انتقام

(جنوری ۱۹۱۶ء ص۱۰، ۱۱)

نصف مضمون میں یگانہ انتقام لینے کو انسانی فطرت کا تقاضا اور معاف کر دینے کو ایک فضیلت قرار دینے کے بعد لکھتے ہیں:

"انتقام کی ممانعت میں یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ تزکیۂ نفس اور اخلاقی تعلیم کو مدِنظر رکھ کر عرض کیا گیا مگر معاشرت و تمدن پر نظر رکھ ملک الشعرا ابو طالب کلیم ہمدانی کا یہ قول آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے:

گر دل ایں مخزنِ کینہ ست کہ مردم دارند
ہر کہ یک دل شکند کعبہ اے آباد کند

..... بادی النظر میں انتقام لینا ایک امرِ مذموم معلوم ہوتا ہے، مگر غور کیجیے تو کسی ظالم، بے درد، حسد شعار، کینہ پرور، دشمنِ تہذیب و تمدن سے انتقام لینا درحقیقت اصولِ حکمت پر مبنی ہے۔ منافیِ حکمت نہیں ہے بلکہ سوسائٹی کو اس کی سخت ضرورت ہے ... کسی مجرم سے انتقام نہ لینا کریم النفسی

تو ضرور ہے مگر اس جرم سے سوسائٹی کو جو نقصانات پہنچ جاتے ہیں کیا ایسی چشم پوشیوں سے ان نقصانات کی تلافی ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ چشم پوشی اگرچہ برگزیدہ نفوس کی شان ہے مگر دنیا میں تمدّن و معاشرت کا پابند رہ کر اس پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا۔ انتقام یا قصاص کو (جن کا مفہوم ایک ہے) وحشیانہ انصاف کہہ کر ٹال دینا اور جرائم سے چشم پوشی کرنا ہرگز ہرگز سوسائٹی کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا۔"

"انتقام کی جائز صورت یہی ہے کہ کوئی شخص عنانِ حکومت کو اپنے ہاتھ میں نہ لے بلکہ رسم و رواجِ ملکی کے اعتبار سے داد خواہ ہو کر حاکمِ وقت کے ذریعے سے انتقام لے ورنہ انتقام بجائے رفع شر کے سوسائٹی کو نقصان پہنچائے گا اور انتقام کا مقصدِ اصلی فوت ہو جائے گا۔"

"اور اگر قوانینِ تمدّن ہی درہم و برہم ہو گئے ہوں ... تو ایسے مقام پر اپنے کانشنس کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیئے، نفسانیت کو دخل نہ دینا چاہیئے۔ بہرحال سوسائٹی کی تہذیب قائم رکھنا ضروری ہے۔"

۵۔ رسم و رواج کا اثر

(جولائی ۱۹۱۶ء ص ۲۱۶، ۲۱۷)

اس مختصر مضمون کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

"انسان کی جیسی خواہشیں ہوتی ہیں ویسے ہی اس کے خیالات بھی ہوتے ہیں اور جیسے خیالات ہوتے ہیں ویسے ہی عمل ہوتے ہیں۔ مقتضائے فطرت تو یہی ہے کہ انسان کے افعال بھی انہیں خیالات اور خواہشوں کے تابع ہوں، مگر اس کلیے کے خلاف بھی اکثر عمل میں آتا ہے کیونکہ انسان کے افعال و حرکات زیادہ تر وہی ہوتے ہیں جن کا وہ ہمیشہ سے عادی ہو گیا ہے،

یعنی دوسرے لفظوں میں رسم و رواج کی سختیوں سے اپنی فطرت اور اپنے نقطۂ خیال کے خلاف بھی عمل کرنے کا پابند رہا ہے۔ رسم و رواج معاشرتِ انسانی کے لیے بہ منزلہ حاکم جابر کے ہیں جس کے آگے نہ فطرت کا زور چل سکتا ہے نہ کسی قسم کی نصیحت یا ترغیب و تحریص کام دے سکتی ہے... اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فطرت ہر شے پر غالب رہتی ہے مگر کسی حکیم کا قول ہے کہ فطرتِ انسانی یا کسی کی شورش انگیز نصیحتیں ہرگز اتنی قوت نہیں رکھتیں کہ رسم و رواج پر غالب آجائیں۔"

رسم و رواج کے کچھ بُرے نمونوں (ستی کی رسم وغیرہ) کی مثالیں پیش کرنے کے بعد مضمون کو اس طرح نتیجہ خیز بنا کر ختم کیا گیا :

"خلاصہ اس تقریر کا یہ ہے کہ جب رسم و رواج ہم لوگوں کے لیے ایک مجسٹریٹ کا حکم رکھتے ہیں جس کی ہدایت پر عمل نہ کرنا جرم سمجھا جاتا ہے تو مقتضائے عقل یہ ہے کہ ناپسندیدہ رسوم کی بیخ کنی کر دی جائے اور چونکہ رسم و رواج لڑکپن ہی سے انسان کی طبیعت میں جڑ پکڑ لیتے ہیں لہٰذا اصلاحِ تعلیم و تربیت کا حق یہ ہے کہ وہی رسم و رواج داخلِ معاشرت کیے جائیں جو قوانینِ قدرت کے خلاف نہ ہوں۔ فطرت کی مخالفت کا نتیجہ نیک نہیں ہو سکتا۔"

الفاظ مہنّد بہ عطف و اضافت

(اپریل، مئی ۱۹۱۶ء ص ۱۳۳ تا ۱۴۴)

مضمون کے شروع میں مندرجۂ ذیل نوٹ ہے :

"یہ مضمون زمانے کے فروری نمبر میں نکل چکا ہے مگر ایڈیٹر کی قابلیت کی وجہ سے نہایت غلط چھپا۔ درمیان میں سے کئی سطریں اڑا دی گئیں جس سے ربط جاتا رہا۔ چونکہ یہ مضمون زبانِ اردو کی اصلاح کے لیے نہایت ضروری ہے

اور قابلِ غور ہے لہٰذا اس کی مکرّر اشاعت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ نظر ثانی میں کچھ اضافہ بھی ہوگیا ہے۔"

پیشِ نظر تحریروں کا یہ سب سے اہم مضمون آتشؔ کے اس شعر پر بحث سے شروع ہوتا ہے:

کسی کی محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا

اس شعر پر سخت گیر اہلِ زبان کا اعتراض یہ ہے کہ اس میں لفظِ "محرم" جن معنوں میں استعمال ہوا ہے ان معنوں میں عربی اور فارسی میں استعمال نہیں ہوتا لہٰذا اب یہ ہندوستانی لفظ ہوگیا اور اس مہنّد صورت میں اس کے ساتھ عربی فارسی لفظوں کی طرح اضافت یا عطف کا استعمال جائز نہیں۔ یگانہؔ نے اس استدلال کی مخالفت میں بڑی حد تک فیصلہ کُن بحث کرتے ہوئے اس قسم کے مہنّد لفظوں کے ساتھ عطف و اضافت کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"بعض حضرات کے نزدیک لفظِ "محرم" کی اضافت "آبِ رواں" پر غلط ہے اور غلطی کا شبہ اس بنا پر ہے کہ لفظ "محرم" کو ہندی سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ "محرم" کے معنی ہیں راز دار یا بات کا چھپانے والا مگر ہندوستان میں "محرم" کو کنایتہً انگیا کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں کیونکہ انگیا کے لیے ستر پوشی لازم ہے۔ دراصل یہ ایک استعارہ تھا مگر رفتہ رفتہ اس لفظ نے یہ معنی مستقل اختیار کر لیے۔ لیکن اس بنا پر یہ لفظ ہندی یا ہندی الاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ کنایہ و مجازی کی صورت میں کوئی لفظ اپنی ماہیت سے بیگانہ نہیں ہو سکتی۔ لفظِ "محرم" بہ اعتبارِ صورت بھی عربی ہے اور بہ اعتبارِ معنی بھی اپنے معنیِ وضعی سے تعلق ضرور رکھتی ہے۔ کوئی قطعی مباینت نہیں پائی جاتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ اس کو ہندی کیونکر ٹھہراتے ہیں۔ کیا کوئی لفظ معنیِ وضعی کے عوض معنیِ مجازی میں مستعمل ہو تو اس کی ماہیت بدل جاتی ہے؟

اور ایسی بدل جاتی ہے کہ قابلِ عطف و اضافت بھی نہیں رہتی ؟"

یگانہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ "محرم" اور اس قبیل کے دوسرے عربی فارسی لفظ جو اردو میں اپنے لغوی معنی سے مختلف معنی میں مستعمل ہیں، اسم خاص کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے ہم معنی عربی فارسی لفظ موجود یا مشہور نہیں ہیں، لہٰذا ان اسمائے خاص کے ساتھ عطف و اضافت جائز ہے، مثلاً :

"ساونی ایک قسم کا پھول ہے جو ساون کے مہینے میں پھولتا ہے. اس کا وجود ایران میں نہیں ہے، لہٰذا اس کی عطف و اضافت بھی صحیح ہے، جیسے نہالِ ساونی؛"

اس کے بعد وہ ایک بہت معقول سوال کرتے ہیں :

"اساتذۂ عجم نے جب عربی، ترکی، ہندی الفاظ کو بجنسہٖ یا کچھ تصرف کر کے اپنی زبان میں داخل کر لیا اور اُن پر اپنا قاعدہ جاری کر دیا تو کیا وجہ ہے کہ زبانِ اردو باوجود اس بے مایگی کے غیر زبان کے الفاظ پر تصرف نہ کرے اور اپنا قاعدہ جاری نہ کرے. انگریزی اور اردو زبان کئی زبانوں کا مجموعہ ہے. انگریزی زبان نے ہر قسم کے الفاظ اپنی زبان میں بجنسہٖ یا تصرف کر کے داخل کر لیے، ان پر اپنا قاعدہ جاری کیا اور اپنا دائرہ وسیع کر لیا، پھر اردو کیوں اس اصول سے انحراف کر کے بیجا پابندیوں کو اپنے اوپر لازم کر لے اور اپنے دائرے کو وسعت دینے کے عوض روز بہ روز محدود کرتی جائے ؟"

مہنّد لفظوں کے سلسلے میں یگانہ نے لفظِ "المضاف" پر بھی اچھی بحث کی ہے :

آتش : زہر پرہیز ہو گیا مجھ کو
دورِ درماں سے المضاف ہو

خواجہ عشرت صاحب فرماتے ہیں کہ "المضاف" بجائے "المضاعف" غلط ہے. میں عرض کرتا ہوں کہ یہ قادر الکلام کا تصرف ہے. غلطی تو وہ ہے کہ شاعر دھوکا کھا جائے. کیا حضرتِ آتش "المضاعف" کا املا بھی صحیح نہیں لکھ سکتے تھے ؟

خواجہ عشرتؔ صاحب کو تو المضاعت کے املا کی خبر ہو اور نہ ہو تو حضرت آتشؔ کو ایا بات یہ ہے کہ اردو کے روزمرّہ میں "المضاف" ہی بولتے ہیں، عین ساقط ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت آتشؔ نے غلاف اور خلاف کا قافیہ المضاف کر کر دیا۔ میر انیسؔ، میر تقی میرؔ، خواجہ آتشؔ وغیرہ اپنے روزمرّہ کے آگے صحتِ الفاظ کی پروا نہیں کرتے تھے۔ یہ اعتراض حضرت آتشؔ کی زندگی میں ہو چکا ہے اور انہوں نے یہی جواب دیا کہ المضاعف (عین کے ساتھ) دیوزاد کی زبان ہے اردو میں المضاف (بغیر عین) ہی مستعمل ہے اور یہی صحیح ہے ..... تمام زبانوں کا یہی قاعدہ ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ کچھ نہ کچھ بگڑ کر داخل ہو جاتے ہیں اور ان پر ہر زبان اپنا قاعدہ جاری کر دیتی ہے۔ انشاء اللہ خاں کا یہ کلیّہ ہر زبان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم رہے گا۔ (کہ) .... جو لفظ جس زبان میں جس طرح مستعمل ہو اسی طرح صحیح ہے، از روئے اصل صحیح ہو یا غلط ...... اگر کوئی یہ کہے کہ "ہجر" نہ کہو "ہجَر" کہو، "رشمہ" نہ کہو، "شمّہ" کہو؛ "مُحبّت" نہ کہو "مَحبّت" کہو تو لاکھ برس یہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی یہ کہے کہ "المضاف" نہ کہو "المضاعف" کہو تو ہم یہی کہیں گے کہ المضاعف گو در اصل صحیح ہے مگر المضاعف اردو میں عین کے ساتھ دیوزاد کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ شمّہ اور مُحبّت غلط ہی سہی مگر کوئی اس خیال سے شمّہ یا مَحبّت نہیں کہہ سکتا۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زاہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی "

اس بحث کو تھوڑا اور آگے بڑھانے کے بعد اس سلسلے میں پیش آنے والی عملی دشواریوں کا ذکر کرتے ہیں:

"الفاظ مہنّد کے عطف و اضافت کو غلط ٹھہرانے والے گویا ایک ایسا اصول قائم کرنا چاہتے ہیں جس کی پابندی قریب قریب غیر ممکن سی ہے کیونکہ الفاظ مہنّد کی فہرست کچھ ایسی مختصر نہیں ہے کہ ہر شخص الفاظ مہنّد و غیر مہنّد میں تمیز

کر لے۔ اردو فارسی میں اتنا تو اُفق واقع ہوا ہے کہ اس کی تمیز بہت مشکل ہے، لہٰذا ہم اس کلیے کو مان ہی نہیں سکتے۔ کلیہ وہ قائم کیجیے جو زبان کی اصلاح کرے۔ ایسا کلیہ کس کام کا کہ لوگ قدم قدم پر غلطی کے مرتکب ہوں۔ اسی خوف سے اساتذۂ فارسی نے مہنّد تو مہنّد، ہندی الفاظ میں بھی عطف و اضافت دے کر[ٹ] اس مسئلے کو صاف کر دیا ہے۔ مگر نہ معلوم وہ کون سے حضرات ہیں جو اس کلیے کو توڑنا چاہتے ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مشکل میں پھنسانا چاہتے ہیں"

آخر میں "کلیہ" کی سرخی دے کر یگانہ نے پوری بحث کو اس طرح سمیٹا ہے :

"ماحصل اس بحث کا یہ ہے کہ جن الفاظ کو بہ اعتبارِ معنیٰ و صورت عربی یا فارسی الفاظ سے کچھ بھی مشابہت یا مناسبت یا کوئی تعلق ہو وہ مہنّد کہے جائیں گے اور اُن میں عطف و اضافت مُخلِ فصاحت یا غلط نہ ہوگی۔ ہاں محض ہندی الفاظ جیسے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک وغیرہ قابلِ عطف و اضافت نہیں ہیں۔ بہ اعتبارِ معنی و بہ اعتبارِ قالب جن الفاظ کو عربی یا فارسی سے تعلق و مناسبت ہے ان میں عطف و اضافت ہرگز ہرگز غلط یا غیر مستحسن نہیں ہو سکتی۔ اسی کلیے پر زبانِ اردو کی اصلاح کا دار و مدار ہے۔ باقی ہر شخص اپنے فعل کا مختار ہے۔"

یگانہ کا یہ مضمون ایک متنازعہ فیہ اور بحث انگیز موضوع پر ہے، لیکن کہیں کہیں لہجے کی خفیف سی دُرشتی کے سوا اس میں وہ جارحانہ انداز نہیں ہے جو بعد میں یگانہ کی تنقیدی تحریروں کا خاصہ بن گیا تھا۔

ٹ اس کی مثال میں یگانہ نے یہ مصرعے پیش کیے ہیں :

دگر از شیوہ ہائے رنگ و رنگش (محسن تاثیر)

نہ در آں دیدہ قطرۂ پانی (سنائیؔ)

اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے ایڈیٹر نے اس کے آخر میں اپنی طرف سے یہ نوٹ لکھا ہے:

"نوٹ: جناب یاس عظیم آبادی نے مندرجۂ بالا مضمون نہایت محققانہ تحریر فرمایا ہے۔ اگرچہ بعض حضرات کی جانب روئے سخن ہے اور انہیں اپنا مخاطب صحیح قرار دیا ہے لیکن تہذیب کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھا ہے۔ درحقیقت ایسے مضامین ادبِ اردو کی ترقی کا باعث ہیں۔ اگر جواب میں کوئی اور صاحب بھی مضمون مرحمت فرمائیں گے تو شکریے کے ساتھ درج نظارہ کیا جائے گا اور ہم بہ ذاتِ خود اس مبحث میں ہرگز دخل انداز نہ ہوں گے۔"

(ایڈیٹر)

لیکن "نظارہ" میں کم از کم دسمبر ۱۹۱۶ء کے شمارے تک اس موضوع پر کوئی اور مضمون شائع نہیں ہوا۔

۷۔ کلامِ آتش بہ رنگ صائب

(ستمبر، اکتوبر ۱۹۱۶ء ص ۲۸۱ تا ۲۸۹)

یگانہ کو خواجہ آتش سے بہت عقیدت تھی۔ اپنے پہلے مجموعۂ کلام "نشترِ یاس" (۱۹۱۴ء) کے سرنامے کے طور پر انہوں نے یہ شعر لکھا ہے:

اثر پیدا کیا چاہو سخن میں طرزِ دلکش سے
تو اندازِ بیاں سیکھو انیس و میر و آتش سے

اور خود کو "خاک پائے آتش" لکھا ہے[1]۔ اسی عقیدت مندی کی وجہ سے لکھنؤ میں ان پر "مرزا آتش پرست" کی پھبتی کسی جاتی تھی۔ اس مضمون کی تمہید میں لکھتے ہیں:

---

[1] "نشترِ یاس"، نور المطابع لکھنؤ، اپریل ۱۹۱۴ء (سرورق)

"اہل نظر پر یہ امر روشن ہے کہ خواجہ آتشؔ علیہ الرحمۃ نے عارفانہ اور فلسفیانہ مضامین کو ملاؔ (صائبؔ)۔ ۔ ۔ ۔ اصفہانی کے انداز سے بھی (علاوہ اپنے رنگِ خاص کے) بہت خوب فرمایا ہے۔ اس رنگِ خاص میں بھی خواجہ صاحب کو جو ملکۂ راسخہ حاصل تھا وہ اردو کی دنیا میں اور کسی کو حاصل نہ ہوا۔ اردو گویوں میں اوّلاً تو اس رنگ کو لوگوں نے اختیار نہ کیا، اور ایک ناسخؔ مغفور نے اختیار بھی کیا تو کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ کلام میں مزہ پیدا نہ ہوا کیونکہ وہ خلقی طور پر شاعر ہی نہ تھے۔ شاعرانہ ذوق جس کو مبدءِ فیاض سے عطا ہوا ہے وہ جس رنگ کو اختیار کرتا ہے کچھ نہ کچھ حاصل ہی کر لیتا ہے، چنانچہ خواجہ آتشؔ نے، چونکہ وہ بہت بڑے وہبی شاعر تھے، اس میدان میں بھی بڑے بڑے کارِ نمایاں کیے ہیں۔ اس مضمون میں خواجہ آتشؔ کے انہیں اشعار سے بحث کی جاتی ہے جو ملاؔ صائبؔ کے رنگ میں ہیں۔"

اس کے بعد آتشؔ کے قریب چالیس شعروں کی تشریح و تعریف کی ہے۔ شروع میں یگانہؔ نے یہ نہیں بتایا کہ صائبؔ کے خاص رنگ سے اُن کی مراد کیا ہے، لیکن آتشؔ کے ایک شعر کی تشریح کے ضمن میں انہوں نے مختصراً صائبؔ کے رنگ پر بھی روشنی ڈال دی ہے۔ وہ شعر اور تشریح یہ ہے:

"دوستی نبھتی نہیں ہرگز فرومایہ کے ساتھ
روح جنت کو گئی جسمِ گلی یاں رہ گیا

پہلے مصرعے میں دعویٰ، دوسرے میں دلیل۔ جسمِ گلی کو بہ سبب اس کی بے وفائی کے (کیونکہ یہ روح کا ساتھ نہیں دیتا) فرومایہ سے استعارہ کیا اور یہ خاص رنگ صائبؔ کا ہے۔ تشبیہ و استعارہ سے، بہ شرطے کہ بعید الفہم نہ ہوں، کلام کا زور اور اثر بہت بڑھ جاتا ہے۔ صائبؔ کا کمال تو یہی ہے کہ پیش پا افتادہ باتوں سے ایسے اہم نتیجے اور معنیٔ بلند پیدا کر دیتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے مگر بعض شعرا نے محض خیال بندی اور بیہودہ معنی آفرینی کے شوق میں اپنے کلام کو

بعید الفہم اور دور از کار استعاروں سے ایسا پیچیدہ بنا دیا کہ ذہن کو بجائے مسرت کے نفرت ہوتی ہے۔ جذباتِ پاکیزہ کے علاوہ اگر شعر میں معنیٰ بلند پیدا کرنے کا شوق ہے تو صائبؔ کا کلام دیکھو۔ خیالات نہایت بلند، معنیٰ نہایت نازک مگر اندازِ بیان میں وہ صفائی ہے، بندش میں وہ چستی ہے کہ حسنِ معنیٰ بجلی کی طرح آنکھوں کے آگے جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرائے فصاحت شعار کا کلام شرح کا محتاج نہیں ہوتا۔"

تاہم یگانہ نے آتش کے ان شعروں کی شرح کرنے کی کوشش کی ہے جن کو وہ صائبؔ کے رنگ کا سمجھتے ہیں۔ اس کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہوئے اور ان کا یہ مضمون تنقیدی حیثیت سے کمزور ہے لیکن اس میں کچھ حصے ایسے ملتے ہیں جو یگانہ کے شعری ذوق اور ان کی آتش پسندی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں، مثلاً :

"غنیمت ہی سمجھئے حلقۂ احباب گرد اپنے
یہ دورہ پھر نہ ہوگا گردش افلاک سے پیدا

یہ دورہ پھر نہ ہوگا گردشِ افلاک سے پیدا! ہائے یہ مصرع نہ معلوم کیا اثر رکھتا ہے۔ دل پر اک چوٹ سی لگ جاتی ہے۔ ہم کو تو یہی شاعری پسند آتی ہے۔ شوق ووصل کے مضامین سے نفرت سی ہوتی ہے۔"

"روک منہ پر وار قاتل کا سپر کی طرح سے
مرد کے چہرے کا زیور زخم ہے شمشیر کا

ہندوستان کے تمام شعرا میں خواجہ آتش کا سا مردانہ کلام اور کسی کا نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیت بھی حضرتِ آتش ہی کے لیے ہے۔"

"تمام شعرائے ہند میں بہتر اور حضرتِ آتش نے جن مصیبتوں میں زندگی بسر کی ہے اور جس حد تک عزت و خودداری اور شریفانہ وضع کا پاس کیا ہے وہ اور کسی کا حصہ نہیں ہے۔ ان بزرگواروں نے کیا اور انہوں نے ۔۔

ایسی سختیاں جھیلیں تو خدا نے ان کے کلام میں بھی وہ اثر بخشا جو ہونا چاہیے.
شوق و وصل کے ناپاک جذبات بیان کرنے میں جن شعرا نے عمریں تج دیں
ان کی شاعری چھچھوری اور نفرت انگیز ثابت ہوئی، قابلِ احترام نہ سمجھی گئی . . . . .
اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ عاشقانہ مضامین غزل میں داخل نہ کیے جائیں
بلکہ یہ مطلب ہے کہ عشقِ صادق کے جذبات حوالۂ قلم کئے جائیں اور عشق و
ہوس میں فرق رکھا جائے ''۔

" اہلِ فہم کے نزدیک تو خواجہ آتشؔ کی شاعری روحانی وعظ و تنبیہِ
نفس کا حکم رکھتی ہے۔ مگر سخن دل پذیر کے لیے دل سخن پذیر بھی شرط ہے۔ مانو
تو بُت، نہیں تپھر۔ جس دل میں جوہرِ قابل ہی نہ ہو وہ ایسی شاعری سے کیا فیض
پا سکتا ہے۔ دنیا میں عقل کے دشمن ایسے بھی ہیں جو خواجہ آتشؔ پر جہالت کا الزام
بے جا رکھ کر ان کی شاعری کو ذلیل ثابت کرنے کی کوششِ بے سود کرتے
ہیں۔ بہ فرضِ محال وہ جاہل ہی سہی، مگر کسی جاہل کے کلام سے اگر ایسے روحانی
سبق حاصل ہوں تو ہزار پڑھے لکھے اس جہالت پر قربان ہیں۔ افسوس ہے
ان لوگوں کی جہالت پر جو اپنے زعمِ باطل میں محض علومِ ظاہری کے ابتدائی مراحل
طے کر لینے کو علم سے تعبیر کرتے ہیں اور علوم باطنی کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ مردانِ
خدا کی قدر نہیں کرتے۔ نہ یہ جانتے ہیں کہ محض علوم ظاہری کی تحصیل انسان کو اپنے
صحیح معنوں میں انسانِ کامل نہیں بنا سکتی جب تک علومِ باطنی کی تکمیل نہ ہو۔ بھلا
ایسے عقل کے دشمن خواجہ آتشؔ کو (جن کو مردِ عارف اور انسانِ کامل ہونے کا شرف
حاصل تھا) کیا سمجھیں گے۔ کیا عجب ہے اگر آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا
مولا علی مرتضیٰؑ اس عالم میں پھر سے جلوہ فرما ہو کر وعظ و تلقین سے سرفراز فرمائیں
تو یہ لوگ اُن کے اقوال کو بھی یہی کہہ کر ٹال دیں کہ اجی ان کے قول کا کیا اعتبار،
نہ بی۔ اے، ایم۔ اے کی سرٹیفکٹ حاصل کی، نہ ندوۃ العلما کا امتحان پاس کیا۔"

تمام شعرائے حال کی خدمت میں اپیل

(جولائی ۱۹۱۶ء ص ۲۲۴ تا ۲۲۶)

یگانہ کی زیرِ گفتگو تحریروں میں سب سے غیر متوقع یہی اپیل ہے جو یہاں تمام و کمال درج کی جاتی ہے:

"حضرات! چند روز ہوئے کہ میں سراج المحققین مولانا خانِ آرزو کے "تذکرہ" مجمع النفائس" کی سیر کر رہا تھا جس میں حضرتِ موصوف نے ایک واقعہ تحریر فرمایا ہے کہ ایک دن ایک شخص ایک بیاض ان کے پاس لایا جس میں اُس وقت کے موجود شعرائے عجم اور شعرائے ہند کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اشعار تھے۔ اُس شخص نے خان موصوف سے بھی یہ استدعا کی کہ آپ بھی اپنے کچھ چیدہ اشعار اس بیاض پر تحریر فرمادیں، چنانچہ خانِ موصوف نے بھی اپنے چند اشعار لکھ دیے اور بیاض اُس کے حوالے کر دی۔ خانِ موصوف نے اس بیاض کی بہت تعریفیں فرمائی ہیں۔

"یہ نقل دیکھ کر مجھے بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر شعرائے حال کے اشعار اسی طرح ایک کتاب میں جمع کر دیے جائیں تو آج سے سو برس بعد وہ بھی ایک چیز ہوگی۔ اگرچہ آجکل ایک دوسرے کو خاطر میں نہیں لاتا مگر اس دور کے بعد یہی شعرا زبانِ اردو کے محسن سمجھے جائیں گے۔ لہٰذا اکم ترین نہایت ادب سے تمام حضرات کی خدمت میں دست بستہ عرض پرداز ہے کہ فلسکیپ سائز کے فقط ایک صفحے پر اپنی پسند کے جتنے شعر لکھ کر مجھے بھیج دیں۔ مگر اپنے دستِ خاص سے تحریر فرمائیں، کسی اور سے نہ لکھوائیں۔ شعر لکھنے کے قبل سرے پر اپنا نام مع ولدیت و سکونت و سنہ ولادت بھی ضرور تحریر فرمائیں اور اگر تاریخ ولادت بھی یاد ہو تو اور بھی مناسب ہے۔ حضرات، اس میں فقط دو پیسے

کے ڈاک ٹکٹ کا خرچ ہے اور ایک ورق کاغذ کا، مگر کاغذ بوسیدہ نہ ہو،
روشنائی خراب نہ ہو۔ یہ کوئی ایسی رقم نہیں ہے کہ آپ حضرات میری التجا کو قبول
نہ فرمائیں۔ میں اس نادر اور یادگار مجموعے کو اپنی زندگی تک اپنے پاس رکھوں
گا اور مرتے وقت مہلت ہوئی تو کسی بڑے کتب خانے میں بھجوا دوں گا اور
وصیت کر جاؤں گا کہ یہ مجموعہ حتی الوسع محفوظ رکھا جائے۔ کیا اچھا ہوتا اگر کوئی صاحب
جن کو مصوری کا شوق ہو وہ آجکل کے تمام شعرا کا فوٹو مہیا کر کے اسی طرح ایک البم تیار
کرتے اور کسی کتب خانے میں رکھوا دیتے۔ میر تقی میر، سودا، درد، آتش، مومن، ذوق
نصیر، جرأت، ناسخ وغیرہ تمام شعرائے باکمال کی تصویر کے لیے دل تڑپتا ہے۔
مگر اس زمانے میں اس خیال کے لوگ ہی نہ تھے کہ ان لوگوں کی تصویریں مہیا کرتے۔
مگر آجکل اس روشن زمانے میں بھی یہ کام نہ کیا گیا تو نہایت افسوس کی بات ہے۔

"اخبار و جرائد کے ایڈیٹروں سے دست بستہ گزارش ہے کہ میری اس اپیل
کو اپنے اپنے پرچوں میں مکرر شائع کر کے ممنونِ احسان فرمائیں اور ایک قومی
یادگار قائم کرنے میں مدد دیں۔

"جناب والا، میری یہ اپیل عام ہے۔ جو شخص میری استدعا کو قبول کرے گا
میں احسان مند ہوں گا، مگر جن شعرا کے نام اس وقت مجھے یاد ہیں وہ ذیل میں درج
کیے دیتا ہوں۔ واضح ہو کہ اس فہرست میں کوئی ترتیب قائم نہیں کی گئی ہے۔ جو
نام یاد آگیا، لکھ دیا گیا۔"

اس کے بعد یگانہ نے جن ایک سو اکتیس (۱۳۱) شاعروں کی فہرست دی ہے ان میں
وہ شاعر بھی شامل ہیں جو یگانہ کو اور جن کو خود یگانہ خاطر میں نہ لاتے تھے، مثلاً صفی، ثاقب، عزیز،
محشر وغیرہ۔ اس فہرست سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ۱۹۱۶ء کے آس پاس اردو کے ممتاز شاعر
کون کون تھے۔

جیسا کہ یگانہ نے لکھا ہے، اس فہرست میں کوئی ترتیب قائم نہیں کی گئی ہے (سوا اس
کے کہ کہیں کہیں ایک شہر کے کئی شاعروں کا اندراج ایک سلسلے سے کیا گیا ہے) اکبر الہ آبادی

نظم طباطبائی، شاد عظیم آبادی، کشن پرشاد شاد، اوج لکھنوی، رشید لکھنوی سے شروع ہو کر شفیق ہاپوڑی، حافظ پیلی بھیتی، ارشد تھانوی، قیصر بھوپالی، محوی پر یہ فہرست ختم ہوتی ہے۔ ذیل میں اس کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دے کر درج کیا جاتا ہے:

۱۔ آرزو عظیم آبادی
۲۔ آرزو لکھنوی
۳۔ آزاد عظیم آبادی
۴۔ آسی ہاپوڑی
۵۔ ابر شاہجہاں پوری
۶۔ ابر قدوائی
۷۔ ابر لکھنوی
۸۔ احسن لکھنوی
۹۔ احسن مارہروی
۱۰۔ اخگر (؟)
۱۱۔ ارشد تھانوی
۱۲۔ ارم لکھنوی
۱۳۔ اطہر ہاپوڑی
۱۴۔ افروز عظیم آبادی
۱۵۔ افضل لکھنوی
۱۶۔ اقبال
۱۷۔ اکبر الہ آبادی
۱۸۔ امداد عظیم آبادی
۱۹۔ امید عظیم آبادی
۲۰۔ انجم لکھنوی
۲۱۔ اوج گیاوی
۲۲۔ اوج لکھنوی
۲۳۔ باسط بسوانی
۲۴۔ باغ سنبھلی
۲۵۔ باقر عظیم آبادی
۲۶۔ برتر حیدر آبادی
۲۷۔ برق حیدر آبادی
۲۸۔ برق دہلوی
۲۹۔ بزم اکبر آبادی
۳۰۔ بسمل (؟)
۳۱۔ بلیغ لکھنوی
۳۲۔ بہار لکھنوی
۳۳۔ بیباک شاہجہاں پوری
۳۴۔ بیتاب عظیم آبادی
۳۵۔ بیتاب لکھنوی
۳۶۔ بیخود رام پوری
۳۷۔ بیخود دہلوی
۳۸۔ بیخود موہانی
۳۹۔ ثاقب اکبر آبادی
۴۰۔ ثاقب لکھنوی
۴۱۔ ثروت لکھنوی
۴۲۔ جاوید لکھنوی
۴۳۔ جگر مراد آبادی
۴۴۔ جلیل مانک پوری
۴۵۔ جودت لکھنوی
۴۶۔ چکبست لکھنوی
۴۷۔ حافظ پیلی بھیتی
۴۸۔ حامد علی خاں بیرسٹر
۴۹۔ حسرت موہانی
۵۰۔ حضور مراد آبادی
۵۱۔ حفیظ جون پوری
۵۲۔ حفیظ عظیم آبادی
۵۳۔ حمد لکھنوی
۵۴۔ حمید لکھنوی
۵۵۔ حمید میرٹھی
۵۶۔ حیدر عباس عظیم آبادی، میر
۵۷۔ خیال عظیم آبادی

۵۸۔ دانش لکھنوی
۵۹۔ دل شاہجہاں پوری
۶۰۔ دلگیر اکبر آبادی
۶۱۔ دلبر مارہروی
۶۲۔ ذاکر لکھنوی
۶۳۔ رسوا شاہجہاں پوری
۶۴۔ رشید لکھنوی
۶۵۔ رضا فرنگی محلی
۶۶۔ رعب لکھنوی
۶۷۔ رفیق ہاپوڑی
۶۸۔ رمز مراد آبادی
۶۹۔ ریاض خیر آبادی
۷۰۔ سائل دہلوی
۷۱۔ سعید عظیم آبادی
۷۲۔ سفیر کاکوری
۷۳۔ سیماب اکبر آبادی
۷۴۔ شاد عظیم آبادی
۷۵۔ شاد، ہز اکسیلنسی (کشن پرشاد)
۷۶۔ شاعر دہلوی
۷۷۔ شاعر لکھنوی
۷۸۔ شائق عظیم آبادی
۷۹۔ شرر لکھنوی
۸۰۔ شرف لکھنوی

۸۱۔ شفیق گیاوی
۸۲۔ شفیق ہاپوڑی
۸۳۔ شمش (؟)
۸۴۔ شوخ اکبر آبادی
۸۵۔ شوق قدوائی
۸۶۔ شوکت میرٹھی
۸۷۔ شہرت لکھنوی
۸۸۔ شیدا عظیم آبادی
۸۹۔ صفدر مرزا پوری
۹۰۔ صفی لکھنوی
۹۱۔ صہبا مراد آبادی
۹۲۔ طالب دہلوی
۹۳ عارف لکھنوی
۹۴۔ عرش گیاوی
۹۵۔ عزیز لکھنوی
۹۶۔ عزیز منصور پوری
۹۷۔ عطا بدایونی
۹۸۔ علوی کاکوری
۹۹۔ غریب سہارنپوری
۱۰۰۔ فائق لکھنوی
۱۰۱۔ فصاحت لکھنوی
۱۰۲۔ فضا (؟)
۱۰۳۔ قرار شاہجہاں پوری

۱۰۴۔ قیصر بھوپالی
۱۰۵۔ کلیم لکھنوی
۱۰۶۔ کلیم مراد آبادی
۱۰۷۔ کوثر خیر آبادی
۱۰۸۔ محشر لکھنوی
۱۰۹۔ محوی (؟)
۱۱۰۔ مسلم عظیم آبادی
۱۱۱۔ مضطر خیر آبادی
۱۱۲۔ مفتوں کوٹوی
۱۱۳۔ موج عظیم آبادی
۱۱۴۔ مہر منشی خورشید علی
۱۱۵۔ مہر منشی نارائن پرشاد
۱۱۶۔ نازش بدایونی
۱۱۷۔ ناصری لکھنوی
۱۱۸۔ ناطق لکھنوی
۱۱۹۔ ناطق ہاپوڑی
۱۲۰۔ نجم اکبر آبادی
۱۲۱۔ ندرت میرٹھی
۱۲۲۔ نظر لکھنوی
۱۲۳۔ نظم طباطبائی
۱۲۴۔ نوح ناروی
۱۲۵۔ نہال عظیم آبادی
۱۲۶۔ واصف اکبر آبادی

۱۲۷۔ وجاہت جھنجھانوی ۱۲۹۔ وحشی دیوبندی ۱۳۱۔ وفا (؟)
۱۲۸۔ وحشت کلکتوی ۱۳۰۔ وحشی شاہجہاں پوری

آخر میں لکھتے ہیں :

" اور نام اس وقت یاد نہیں، مگر تمام شعرائے حال کی خدمت میں دست بستہ مکرر عرض ہے کہ بہت جلد اپنا اپنا کلام مرحمت فرماکر بندۂ احسان بنائیں ۔

والسلام

کم ترین مرزا واجد حسین یاسؔ، لکھنوی، جھوائی ٹولہ "

یقین ہے کہ یگانہ کی یہ اپیل صدا بہ صحرا ثابت نہ ہوئی ہوگی اور انھیں کچھ شاعروں کا خود نوشتہ کلام ضرور موصول ہوگیا ہوگا۔ لیکن بعد میں ان کی در بدری اور آخر میں ان کے مکان پر حملے کے نتیجے میں جس طرح اُن کی اور بہت سی چیزیں تلف ہوئیں اسی طرح غالباً یہ قیمتی اوراق بھی اِدھر اُدھر ہو گئے ۔

یگانہ اور تنقیدِ کلامِ عزیز

لکھنؤ کے شاعروں صفی، ثاقب، عزیز، محشر وغیرہ کے ساتھ یگانہ چنگیزی کے ادبی معرکے مشہور ہیں۔ اِن معرکوں میں یگانہ نے عزیز لکھنوی کو خاص طور پر نشانہ بنایا تھا اور ان کے خلاف ایک پوری کتاب "شہرتِ کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز" کے نام سے شائع کی تھی۔ یہ کتاب بہت کم یاب ہے۔ اس کا دیباچہ مولوی غازی الدین عجمی کے نام سے یگانہ نے خود لکھا ہے۔ یہ دیباچہ اور کتاب کی تمہید یگانہ کے ادبی معرکوں اور لکھنؤ کے شاعروں سے ان کے اختلافات کے متعلق معلومات کے اہم ماخذ ہیں۔ لیکن اسی اہمیت کی وجہ سے کتاب کے اصل موضوع یعنی تنقیدِ کلامِ عزیز، کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔

۱۔ جماہی آئی پھولوں کو اُدھر ذکرِ صراحی سے — اِدھر غنچوں نے شاخوں پر ہر اک پورا پنی چٹکائی

یگانہ کو اس شعر پر دو اعتراض ہیں۔ ایک یہ کہ جماہی آنے سے مراد کلی کا کِھل کر پھول بن جانا تو ہو سکتا ہے، لیکن پھول جس کا منہ پہلے ہی کُھل چکا ہوتا ہے اس کے لیے جماہی آنے کا ذکر مناکب اظہار نہیں ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "ہر اک پور اپنی چٹکائی" کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ غنچے میں کئی پوریں ہوتی ہیں اور وہ کئی بار چٹکتا ہے۔ یہ خلافِ واقعہ ہے اس لیے کہ ایک غنچہ ایک ہی بار چٹکتا ہے۔

۲۔ چمن ہے اور شبِ مہتاب کی پھیلی ہوئی چادر — اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا تجلّی ہی نظر آئی

یگانہ کو اس پر "اعتراض یہ ہے کہ مہتاب کی چادر تو عام استعارہ ہے مگر شبِ مہتاب کی چادر نیا مال ہے"۔ لیکن یگانہ نے یہ نہیں بتایا کہ "شبِ مہتاب کی چادر" میں کوئی فنی یا معنوی سقم بھی ہے یا وہ اس کے صرف "نیا مال" ہونے پر معترض ہیں۔

۳۔ کہیں پر ہے بتانِ خطۂ شیراز کی صحبت — کہیں معشوقِ تبریزی کہیں ترکانِ یغمائی

"کہیں" میں لفظ "پر" یگانہ کی رائے میں بھرتی کے لیے لایا گیا ہے۔

۴۔ بیانِ صحنِ گلشن حسن و عشق آپس میں نازاں ہیں — ہر اک کو ان میں ہے اپنی جگہ نازِ خود آرائی

اعتراض اس پر ہے کہ خود آرائی حُسن کی صفت ضرور ہے لیکن عشق کے لیے اس صفت کا استعمال غلط ہے۔

۵۔ رہی دن بھر یہ صحبت گرم حسن و عشق میں باہم — ہوئی جب رات اور صحنِ چمن میں چاندنی آئی

اعتراض: سلسلۂ کلام کے لحاظ سے یہ شعر بے محل ہے، اس لیے کہ اس سے پہلے چمن اور چاندنی کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

۶۔ صدا یہ ہے کہ قدم تک کسی کی زلف آئی — ہے تا بہ حشر اسیر دل کی مدّتِ میعاد

اعتراض: "میعاد" میں خود ہی "مدّت" کا مفہوم شامل ہے، لہٰذا "مدّتِ میعاد" ایسا ہی ہے جیسے "روز قیامت کا دن"۔

۷۔ گلے میں جس کے ہو طوق اور پاؤں میں زنجیر — دیارِ عشق میں ہے وہ ہی بندۂ آزاد

اعتراض: "وہی" کی جگہ "وہ ہی" یہاں فصاحت کے خلاف ہے۔

۸۔ وہ بابِ علم پہ باندھا گیا ہے بند ھنوار — ہے شورِ شادیِ میلادِ خاصۂ ذوالمنن

اعتراض: یہ شعر حضرت امام حسنؑ کی ولادت کے ذکر میں ہے۔ عرب میں بندھنوار باندھنے کا رواج نہیں ہے۔ لیکن یہ بات اتنی قابلِ اعتراض نہیں ہے جتنی یہ کہ لکھنؤ میں بھی بندھنوار ولادت کے موقعے پر نہیں بلکہ شادی کے موقعے پر باندھا جاتا ہے۔ اور اس سے زیادہ قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ حدیثِ رسولؐ کی رو سے "بابِ علم" حضرت علیؑ ہیں، اس لیے یہ کہنا کہ "بابِ علم" پر بندھوار باندھا گیا مضحکہ خیز ہے۔

۹۔ یعنی جب تک ہے یقینِ علم اعداد ہر میں — پردۂ غیبت میں ہے اس وقت تک جلوہ گری

اس شعر پر یگانہ نے پہلے یہ اعتراض کیا تھا کہ "یقین" اور "علم" میں ایک لفظ حشوِ محض ہے۔ جب اس کا یہ جواب دیا گیا کہ قصائدِ عزیز میں "یقینِ علمِ اعدا" نہیں "یقینِ ظلمِ اعدا" چھپا ہے تو اپنے نظری دھوکے کا اعتراف کر کے اب انہوں نے یہ اعتراض کیا کہ غیبتِ امام زمانہؑ کا یہ سبب احادیث میں بیان نہیں ہوا ہے کہ وہ ظلمِ اعدا کے یقین کی وجہ سے روپوش ہیں۔ اس شعر سے امام پر خائف ہونے کا الزام آتا ہے جو شانِ امامت کے خلاف ہے۔

۱۰۔ اس شان سے افادہ احکامِ حق کیے ہیں — ہاتھوں پر اپنے روحِ اسلام کو لیے ہیں

اعتراض: پہلے مصرعے میں فارسی کے فقرے "احکامِ حق افادہ نمود" کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ جو غیر فصیح ہے۔

۱۱۔ روایت سے کوئی برہانِ ملّی پیش کرتا ہے — درایت سے کوئی لاتا ہے استدلال دعوے پر

اعتراض: "دلیل لانا" کی جگہ استدلال لانا" محاورے کے خلاف ہے۔

۱۲۔ الٰہی تا قیامت مامتا تیری رہے ٹھنڈی — پھلے پھولے ترا بچّہ بہ زیرِ ظلِّ سبحانی

اعتراض: پورے شعر کے نرم اور شیریں الفاظ کے ساتھ "بہ زیرِ ظلِّ سبحانی" کی ثقالت ناگوار گذرتی ہے۔

۱۳۔ پھر میں خلیلِ دل کو سناتا ہوں اک نوید — محنت کا اس کی راز نمایاں کیے ہوئے

اعتراض: ردیف چسپاں نہیں ہے اور شعر کا مفہوم الفاظ ادا نہیں کر پا رہے ہیں۔

۱۴۔ شوقِ اذانِ صبح میں بستر لگائے ہوں — کعبے کی چھت پہ سونے کا ساماں کیے ہوئے

اعتراض: شعر مضحکہ خیز ہے۔

۱۵۔ جاتا ہوں مدرسے سے طرب گاہِ شوق پھر — سب درس درجِ دفترِ عصیاں کیے ہوئے

اعتراض: "طرب گاہِ شوق جاتا ہوں" خلافِ محاورہ ہے۔ "طرب گاہِ شوق کو جاتا ہوں" کہنا چاہئے۔

۱۶۔ مصروفِ اہتمامِ خلش ہو رہا ہوں میں — پیوندِ روح پھر ترا پیکاں کیے ہوئے

اعتراض: پیکان کے پیوندِ روح ہو جانے کے بعد اہتمامِ خلش" بے معنی ہو جاتا ہے۔

۱۷۔ یہ کون کوہِ طور سے موسیٰ نکل گیا — جلوہ شعوقِ در سے نمایاں کیے ہوئے

اعتراض: ۱. "موسیٰ نکل گیا" فصاحت کے خلاف ہے۔ یہاں حرفِ ندا ضروری تھا (اے موسیٰ)، ۲۔ "شگافِ در" کی جگہ "شقوق" کی عربیت ناگوار ہے، ۳. کوہ طور میں کوئی در نہ تھا، اس لیے "شقوقِ در" معنوی اعتبار سے بھی غلط ہے۔

۱۸. بیٹھی ہوئی ہیں فاطمہ بنت اسد کے پاس زینت جہاں کی دخترِ عمراں کیے ہوئے

اعتراض: حضرت مریم کے ساتھ اتنی زیب و زینت کا ذکر حفظِ مراتب کے خلاف ہے۔

۱۹. وہ نکلیں فاطمہ وہ ملا پھر شگافِ در جیسے کوئی تبسم پنہاں کیے ہوئے

اعتراض: ۱. "تبسم کیے ہوئے" خلاف محاورہ ہے، ۲. حضرتِ علیؑ کی ولادت کے موقع پر کعبے کی دیوار میں شگاف پڑا تھا نہ کہ در میں۔ "شگافِ دیوار" کی جگہ "شگاف در" کہنا خلافِ واقعہ ہے، ۳. مصرعے کی بندش اتنی کمزور ہے کہ تشبیہ کا لطف جاتا رہا۔

کلامِ عزیز پر یگانہ کے اعتراض بڑی حد تک درست ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان اعتراضوں کے ذریعے عزیز کے کلام کی جو خامیاں سامنے آتی ہیں وہ اس قدر سنگین نہیں ہیں جس قدر یگانہ نے انھیں اپنے لہجے کے زور پر ثابت کرنا چاہا ہے، اسی لیے اس تنقید سے عزیز کی شعری شخصیت زیادہ مجروح نہیں ہوئی، بلکہ یگانہ نے "شہرتِ کاذبہ" میں جو تلخ و تند اور اشتعال انگیز لہجہ اختیار کیا اس سے ان کی اپنی تنقیدی شخصیت مجروح ہو گئی۔

۵

تصنیفاتِ میرزا یگانہ

۱۔ نشترِ یاس : (نور المطابع، لکھنؤ اپریل ۱۹۱۴ء)

۲۔ چراغِ سخن : (طبعِ اوّل ۱۹۱۴)

" : (طبع دوم مطبعِ نول کشور، لکھنؤ دسمبر ۱۹۲۱ء)

۳۔ شہرتِ کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز : (اصح المطابع، لکھنؤ، سرورق مطلع النور پریس، علی گڑھ ۱۹۲۵ء)

۴۔ آیاتِ وجدانی : (طبعِ اوّل، مطبعِ کریمی، لاہور ۱۹۲۷ء)

" (طبع دوم۔ دلّی پرنٹنگ ورکس، دہلی ۱۹۳۴ء)

" (طبع سوم۔ اعظم اسٹیم پریس، حیدر آباد دکن ۱۹۴۵ء)

۵۔ ترانہ : (عالم گیر الکٹرک پریس، لاہور، ستمبر ۱۹۳۳ء)

۶۔ غالب شکن : (طبع اوّل۔ آرمی پریس، دیال باغ، آگرہ ۱۹۳۴ء)

" : (طبع دوم ("دو آتشہ") آرمی پریس، دیال باغ، آگرہ ۱۹۳۵ء)

۷۔ گنجینہ : (کوآپریٹو کیپٹل پرنٹنگ پریس، لاہور ۱۹۴۸ء[1])

---

[1] "گنجینہ" کا سنہ اشاعت بحوالہ ماہنامہ "شاعر" بمبئی۔ شمارہ ۹۸ (نیّر مسعود

۶

یگانہ

کی

تصنیفوں کے سرورق

(سنینِ اشاعت کے اعتبار سے)

"نشترِ یاس" ۱۹۱۴ء

اثر پیدا کیا چاہو سخن میں طرزِ دلکش سے
تو اندازِ بیاں سیکھو انیسؔ و میرؔ و آتشؔ سے

حصہ اوّل

نشترِ یاسؔ

یعنی

دیوانِ خاکِ پائے آتشؔ مرزا واجد حسین یاسؔ عظیم آبادی
ساکن حال لکھنؤ جھوائی ٹولہ

باہتمام
احقر الزمن سید نور الحسن مالکِ مطبع
نور المطابع لکھنؤ تھوئی ٹولہ میں چھپا
بماہ اپریل ۱۹۱۴ء
قیمت فی جلد ۸/ بہ ذریعۂ وی پی مصنف سے طلب فرمایئے

"چراغِ سخن" طبع دوم ۱۹۲۱ء

بسمہٖ

مزار یاسؔ پہ کرتے ہیں شکر کے سجدے
دعائے خیر تو کیا اہلِ لکھنؤ کرتے

چراغِ سخن

سنہ ۱۹۱۴ء

رسالۂ عروض و قوافی

جس میں علمِ عروض و قوافی کے نازک مسائل نہایت صاف زبان میں سلجھا کر بیان کیے گئے ہیں۔ ابتدا میں اہلِ زبان و زبان داں کا فرق اور صحیح مفہوم بتایا گیا ہے اور ماہیتِ شاعری پر فلسفیانہ بحث کی گئی ہے۔

مصنفہٗ
ابو المعانی مرزا یاسؔ عظیم آبادی لکھنوی

بہ ماہ دسمبر ۱۹۲۱ء
مطبعِ منشی نول کشور لکھنؤ میں چھپا
طبع ثانی قیمت عصہ

"شہرتِ کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز" ۱۹۲۵ء

۷۸۶

شہرتِ کاذبہ

المعروف بہ

خرافاتِ عزیز

جس میں عزیز لکھنوی کی مصنوعی شاعری کی قلعی کھول کر محققانہ انداز سے دادِ تنقید دی گئی ہے۔ مرزا غالب مصنّف قاطعِ برہان کی ظریفانہ تنقیدوں سے جو لوگ واقف ہیں وہ مصنف رسالۂ ہٰذا کی نقادانہ او ظریفانہ تلخ نوائیوں سے خاص لطف اٹھائیں گے۔ دیباچے میں مولوی غازی الدین بلخی نے مصنف کے کے مردانہ کیریٹر اور گومتی والوں کی شرمناک سازشوں پر جو روشنی ڈالی ہے وہ تاریخی اعتبار سے اک گراں قدر ادبی خدمت ہے۔

از قلم

مرزا یاس یگانہ لکھنوی عظیم آبادی

صرف ٹائٹل پیج مطبع النور پریس علی گڑھ میں بہ اہتمام عبد المقتدر چھپا[۱]

قیمت صرف ۸ / ۱۹۲۵ء

[۱] کتاب کا متن اصح المطابع، لکھنؤ میں چھپا (نیر مسعود)

"آیاتِ وجدانی"، طبع اوّل ۱۹۲۷ء (بیرونی سرورق)

۷۸۶

انظر والی ما قال ولا تنظر الی من قال

آیاتِ وجدانی

مصنفہ

میرزا یگانہ لکھنوی

مع

محاضرات

از

میرزا مراد بیگ شیرازی

حسب فرمائش

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرونِ لوہاری دروازہ، لاہور

کریمی پریس لاہور میں باہتمام میرزا قدرت اللہ پرنٹر چھپا

"آیاتِ وجدانی" طبع اوّل ۱۹۲۷ء (اندرونی سرورق)

۷۸۶

جلوہ فرما حق ہوا باطل گیا

آیاتِ وجدانی

از

میرزا یاس یگانہ لکھنوی

مع

محاضرات

از

میرزا مراد بیگ شیرازی

بہ فرمائش
شیخ مبارک علی تاجرِ کتب اندرونِ لوہاری دروازہ لاہور
مطبعِ کریمی لاہور میں بہ اہتمام میر قدرت اللہ چھپی
بارِ اوّل ایک ہزار ۱۹۲۷ء قیمت :

"ترانہ" ۱۹۳۳ء

ترانہ

یعنی

مرزا یاسؔ یگانہ چنگیزی لکھنوی کی رباعیات کا مجموعہ

ناشر

ہندوستان بھر کے علمی و ادبی اداروں کے

واحد نمائندے

اردو بک سٹال بیرونِ لوہاری دروازہ لاہور

ستمبر ۱۹۳۳ء قیمت عمہ

(سرورق کے چوتھے صفحے پر: "عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں بہ اہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر")

۳۔ آیاتِ وجدانی، طبع دوم ۱۹۳۴ء (بیرونی سرورق)

بہ نام یگانہ

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

آیاتِ وجدانی

طبع ثانی بہ اضافۂ افکارِ جدید

مصنفہ

امام الغزل

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی
سب رجسٹرار حیدرآباد دکن

"آیاتِ وجدانی" طبعِ دوم ۱۹۳۴ء (اندرونی سرورق)

بہ نامِ یگانہ

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

آیاتِ وجدانی

طبعِ ثانی بہ اضافۂ افکارِ جدید

مصنّفہ

امام الغزل

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

سب رجسٹرار حیدرآباد دکن

مطبوعہ دلّی پرنٹنگ ورکس دہلی

 ۱۹۳۴ء قیمت دو روپے

۱۰۰۰ جلد

"غالب شکن" طبعِ اوّل ۱۹۳۴ء

بہ نام یگانہ

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

غالب شکن

مکتوب یگانہ
بہ نام سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

از

امام الغزل
میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی
سب رجسٹرار حیدر آباد دکن

۱۹۳۴ء

۵۰۰ جلد

سرورق کے چوتھے صفحے پر: "دآرمی پریس دیال باغ آگرہ میں بہ اہتمام سیتارام چھپا۔"

"غالب شکن" طبعِ دوم ۱۹۳۵ء

بہ نام یگانہ

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

غالب شکن

(دو آتشہ)

مکتوبِ یگانہ

بہ نام سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

از

امام الغزل
میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی علیہ السلام

سب رجسٹرار لاتور دکن

طبعِ ثانی ایک ہزار سنہ ۱۹۳۵ء قیمت ۵ر

سرورق کے چوتھے صفحے پر: "(آرمی پریس دیال باغ آگرہ)"

"آیاتِ وجدانی" طبعِ سوم ۱۹۴۵ء (بیرونی سرورق)

بہ نام یگانہ

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
آہ کس دن کیلئے ناحق پرستی کیجیے

آیات وجدنی

(جدید)

از

امام الغزل
میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

مع

محاضرات

از

میرزا مراد بیگ چغتائی

۱۹۴۵ء حسب فرمائش جناب میرزا آغا جان صاحب چنگیزی قیمت (صر)
(اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن میں چھپی)

"آیاتِ وجدانی" طبعِ سوم ۱۹۴۵ء (اندرونی سرورق)

له
۸۶

آیاتِ وجدانی

(جدید)

امام الغزل

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

(قیمت صہ ۱۳/ حالی)

له پیشانی پر ۸۶ "یگانہ" کے عدد ہیں (نیر مسعود)

گنجینہ" ۱۹۴۸ء ۹

گنجینہ

میرزا یگانہ چنگیزی

قومی دار الاشاعت

وائی. ایم. سی. اے. بلڈنگ۔ دی مال۔ لاہور

قیمت تین روپیہ چار آنہ

کو اپریٹو کیپٹل پرنٹنگ پریس وطن بلڈنگ لاہور میں چھپی اور
محمد کلیم اللہ پرنٹر و پبلشر نے پروگریسیو بک کلب لاہور سے شائع کیا

۷

یگانہ کی لوحِ تربت

(کربلائے منشی فضلِ حسین خاں، وکٹوریا اسٹریٹ، لکھنؤ)

اللہ اکبر

مرزا واجد حسین یگانہ چنگیزی لکھنوی

تاریخ پیدائش ۱۷؍اکتوبر ۱۸۸۴ء

تاریخ وفات ۴؍فروری ۱۹۵۶ء

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجئے

یگانہ

:—(منتخب کلام):—

نعت

اے آئینۂ انوارِ ازل اے جلوہ گہہ ہر حسن و عمل
ہے دیر سے ٹھنڈا دل کا کنول دیدار دکھا پردے سے نکل
میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

جانِ جہاں مقصودِ دوعالم فرش نشیں اور عرش کا محرم
اشرفِ انساں افضلِ آدم خاک کا پتلا نورِ مجسم
میرے اندھیر گھر کے اجالے
اُٹھ میرے کالی کملی والے

آشفتہ بیانی سُن تو سہی کچھ دردِ نہانی سُن تو سہی
ہاں میری زبانی سُن تو سہی یہ رام کہانی سُن تو سہی
میرے اندھیرے گھر کے اُجالے
اُٹھ مرے کالی کملی والے

دیوانہ ہوں لیکن مست ولا گم گشتۂ منزل سہو و خطا
کچھ دھیان نہ کر جو ہوا سو ہوا گم راہ کو شمعِ جمال دکھا
میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

روشن کر دے شمعِ امید　　مار نہ ڈالے حسرتِ دید
جلوہ ترا سو عید کی عید　　دید کوئی جس کی نہ شنید

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

شمعِ جمال کے پروانے　　تیری طلب میں دیوانے
سنتے ہیں کیا کیا افسانے　　کس روپ ہیں تو ہے خدا جانے

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

غزل

دلِ آگاہ نے جب راہ پہ لانا چاہا　　عقلِ گم راہ نے دیوانہ بنانا چاہا
ناگہاں چرخِ ستمگار نے کروٹ بدلی　　بختِ بیدار نے جب مجھ کو جگانا چاہا
پھر سمانے لگی دنیا کی ہوا "ہیں" کی طرح　　زانوئے فکر سے جب سر کو اٹھانا چاہا
دلِ بیدار نے گھبرا کے مجھے چونکایا　　نفس نے جب کسی مشکل میں پھنسانا چاہا
جذبۂ شوق نے جب عشق کی صورت پکڑی　　پھر مٹائے نہ مٹا لاکھ مٹانا چاہا

جامہ زیبوں پہ کفن نے بھی دیا وہ جوبن
دوڑ کر سب نے کلیجے سے لگانا چاہا

غزل

پیری ہے، قبر اے دلِ مضطر قریب ہے
مرتا تھا جس کے شوق میں وہ گھر قریب ہے

الٹی ہوا زمانے میں چلتی ہے آج کل
آثار کہہ رہے ہیں کہ محشر قریب ہے

سچ پوچھیے تو وہ رگِ گردن سے ہے قریب
پر کس طرح بتاؤں کہ کیونکر قریب ہے

کیا جانے ہم تک آئے گا محفل میں یا نہیں
اتنا تو دیکھتے ہیں کہ ساغر قریب ہے

پاسِ ادب سے جاتے ہیں اب یاس سر کے بل
شاید کہ آستانۂ دلبر قریب ہے

غزل

رسم دنیا نہ سہی فرض ادا کرتے ہیں
ہاتھ اٹھے یا نہ اٹھے دل سے دعا کرتے ہیں

حضرتِ دل ہیں عجب ظالم مظلوم نما
گھر جلا کر کفِ افسوس ملا کرتے ہیں

عمر بیداریِ موہوم کے دھوکے میں کٹی
اب جو چونکے ہیں تو آپ اپنا گلہ کرتے ہیں

بے اجل منزلِ فانوس پہ مرنے والے
جان کیا دیتے ہیں اک رسم ادا کرتے ہیں

پاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے منزل کی طرف
کان اب تک ہوسِ بانگِ درا کرتے ہیں

موت مانگی تھی، خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے، اب ترکِ دعا کرتے ہیں

مثلّث

امید و بیم میں کٹے تو کیا مزہ شباب کا ہوائے دہر دیتی ہے پیام انقلاب کا
الٹ نہ جائے ناگہاں ورق مری کتاب کا

کسی کی کیا مجال ہے جو چرخِ پیر سے لڑے امنڈ رہا ہے ابرِ غم نہ جانے کب برس پڑے
اُندھا ہوا ہے چار سمت بادل انقلاب کا

ہوائے تند دل جلوں کے دل کو روندتی ہے کیا قفس پہ میرے بے دھڑک یہ برق کوندتی ہے کیا
چلے گا بے دلوں سے کچھ نہ زورِ اضطراب کا

نہ مبتدا کی کچھ خبر نہ کچھ خبر کی مبتدا دلِ شکستہ گم ہوا تو پھر کہاں کا سلسلہ
یہی ورق نکل گیا تو مول کیا کتاب کا

نگاہِ تشنہ کام میں حرام بھی حلال ہے نہ کوئی امرِ ممتنع نہ کوئی شے محال ہے
فریب مجھ سے پوچھیے کرشمۂ سراب کا

پکارنے سے کام ہے پکارتا ہوں بار بار دیارِ حُسن میں ہو یاس کیوں کوئی امیدوار
جوابِ باصواب یا جوابِ بے صواب کا

غزل

محبت نے ایمان کھویا تو کیا پشیمانیوں میں ڈبویا تو کیا
امانت میں تیری خیانت نہ کی مگر مفت کا بوجھ ڈھویا تو کیا

یہاں کیا دھرا ہے جو ہاتھ آئے گا — کلیجے میں پنجہ گڑو دیا تو کیا
بہا لے گیا گھر بھی ابرِ کرم — جو بویا تو کیا اور نہ بویا تو کیا
سرِ بزم پیاسے ہی مر جایئے — کہ تلچھٹ سے دامن بھگویا تو کیا
نہا لیتے گنگا بکھیڑا تھا پاک — گناہوں کو زمزم سے دھویا تو کیا
تمہیں بھی مزا اس کا چکھنا پڑا
یگانہ کو ہاتھوں سے کھویا تو کیا

غزل

ہر رنگِ روشن ہر دیدنی کیا — دل تک نہ پہنچے، وہ روشنی کیا
یہ نوجوانی یہ نامرادی — چھائی ہے منھ پر یہ مُردنی کیا
منھ سے نہ بولو سر سے تو کھیلو — ہے ماجرائے ناگفتنی کیا
اندر ہی اندر کیوں کھپ رہے ہو — کر بیٹھے کوئی ناکردنی کیا
ہم ہوں کہ تم ہو دونوں ہیں ٹھنڈے — اب دوستی کیا اور دشمنی کیا
انگور کھٹے ہوں خواہ میٹھے — بے دسترس کی طعنہ زنی کیا
ہر خار و گل ہے یکتا یگانہ
پھر دیدنی کیا نادیدنی کیا

غزل

اپنی ہستی میں بھی کچھ شک آپڑا
علم کا سودا بڑا مہنگا پڑا

آپ سے باہر چلے ہو ڈھونڈنے
آہ پہلا ہی قدم جھوٹا پڑا

وہ جلالِ میرزائی کیا ہوا
آگ ہو کر خاک سے دبنا پڑا

زندہ رکھا ہے سسکنے کے لیے
واہ اچھے دوست سے پالا پڑا

واہ سنتے ہی یگانہ کی غزل
اپنے بیگانے کو بھی چسکا لگا

غزل

وہ جوانی کی موج وہ منجدھار
خیر نیّت بخیر بیڑا پار

سونگھ کر چھوڑ دو حسینوں کو
نہ بنانا کبھی گلے کا ہار

اپنے ہی سائے سے بھڑکتے ہو
ایسی وحشت پہ کیوں نہ آئے پیار

خبطِ مذہب ہو خواہ تحفۂ کفر
جس سے پایا اسی کے سر دے مار

جاگتا خواب دیکھیے کب تک
چشمِ امید پر خدا کی سنوار

بندگی کا ثبوت دوں کیونکر
اس سے بہتر ہے کیجیے انکار

ایسے دو دل بھی کم ملے ہوں گے
نہ کشاکش ہوئی نہ جیت نہ ہار

بن پڑے تو یگانہ بن کر دیکھ
عکس کوئی اتر سکے تو اُتار

غزل

زمانہ خدا کو خدا جانتا ہے — یہی جانتا ہے تو کیا جانتا ہے
خدا ایسے بندے سے کیوں پھر نہ جائے — جو بیٹھا دعا مانگنا جانتا ہے
برائی ہیں تو دیکھتا ہے بھلائی — تو کیا بوم کو بھی ہما جانتا ہے
کدھر جا رہا ہے تراخوں گرفتہ — مگر غیب کا راستہ جانتا ہے
انوکھا گنہگار یہ سادہ انساں — نوشتے کو اپنا کیا جانتا ہے

یگانہ تو ہی جانے اپنی حقیقت
تجھے کون تیرے سوا جانتا ہے

غزل

بندہ وہ بندہ جو دم نہ مارے — پیاسا کھڑا ہو دریا کنارے
دُکھ درد تو ہی سمجھے نہ سمجھے — گونگا تو گونگا کس کو پکارے
قربان تیری اٹکھیلیوں کے — خود سر چڑھائے خود مار اُتارے
فتنہ بھی پامال اپنا بھی یہ حال — کروٹ بدلیے کس کے سہارے

اتنا بھی سیدھا سادہ چلن کیا ایسے کو کوئی کیوں کر ابھارے
ٹکرا کے دیکھیں تم کیا ہو ہم کیا جیتے تو جیتے ہارے تو ہارے
حسنِ یگانہ اللہ اللہ
یہ بھیس بدلے یہ روپ دھارے

ہنوز زندگی تلخ کا مزا نہ ملا کمالِ صبر ملا، صبر آزما نہ ملا
مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں ہے مزاج اس دلِ بے اختیار کا نہ ملا
جواب کیا وہی آوازِ باز گشت آئی قفس میں نالۂ بے جا نکاہ مزا نہ ملا
امیدوارِ رہائی قفس بدوش چلے جہاں اشارۂ توفیق غائبانہ ملا
ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا
امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر کہاں کے دیر و حرم، گھر کا راستا نہ ملا
خوشا نصیب جسے فیضِ عشقِ شور انگیز بقدرِ ظرف ملا ظرف سے سوا نہ ملا
سمجھ میں آگیا جب عذرِ فطرتِ مجبور گناہگارِ ازل کو نیا بہانہ ملا
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا
نگاہِ یاس سے ثابت ہے سعیِ لاحاصل
خدا کا ذکر تو کیا، بندۂ خدا نہ ملا

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا
چراغ لے کے کسے ڈھونڈتے ہیں دیوانے نشاں تو دور رہے، یاں نام تک نہیں دل کا
نہ سر میں نشہ ہے باقی، نہ دل میں کیفیت زباں پہ رہ گیا اک ذکرِ خیر محفل کا
کبھی تو موج میں آئے گا تیرا دیوانہ اشارہ چاہیے ہے جنبشِ سلاسل کا

خود اپنی آگ میں جلتا تو کیمیا ہوتا | مزاج داں نہ تھا پروانہ شمعِ محفل کا
جوابِ حسنِ طلب بے دلوں سے بن نہ پڑا | حیا سے گڑ گئے جب نام آ گیا دل کا
ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر | ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا

حضورِ دوست یگانہ کچھ ایسے غائب تھے
زبانِ گنگ تک آیا نہ ماجرا دل کا

خداؤں کی خدائی ہو چکی بس | خدا را بس دہائی ہو چکی بس
کہیں پتھر بھی ہو سکتا ہے پانی | دعاؤں کی رسائی ہو چکی بس
کسی ڈھب سے نپٹ لو جب مزا ہے | بہت زور آزمائی ہو چکی بس
بجھائے کون تو جس کو جلائے | پتنگوں کی چڑھائی ہو چکی بس
ہوا میں اڑ گیا ایک ایک پتا | گلوں کی جگ ہنسائی ہو چکی بس
بھلا اب کیا بچوں اپنی نظر میں | نظر اپنی پرائی ہو چکی بس
رہا کیا جب دلوں میں فرق آیا | اسی دن سے جدائی ہو چکی بس
بہت پہنچا تو نادیدہ یہ ریجھا | تخیل کی رسائی ہو چکی بس

پڑے ہو کون سے گوشے میں تنہا
یگانہ کیوں خدائی ہو چکی بس

تو کہاں اور کہاں وہ جلوۂ پاک | دلِ بیباک تیری آنکھ میں خاک
کھا گیا کتنے جاں نثاروں کو | پردے پردے میں شعلۂ بیباک
دیکھئے کیا خدا دکھاتا ہے | آپ نازک مزاج، ہم بیباک
گھل گئے، جیسے موم کی مریم | کیوں بڑھایا تھا دل جلوں سے تپاک
بدگمانوں کی مہربانی سے | پاک دامن بچے، نہ دامن چاک

ذات میں اپنی کیا نہیں موجود — عشق سا زہر، عقل سا تریاک
آسماں کی ذرا سی گردش میں — کوئی ہلکان اور کوئی ہلاک
کون ٹھہرے سمے کے دھارے پر — کوہ کیا اور کیا خس و خاشاک
میں کہاں اور کہاں کے پست و بلند — ایک ٹھوکر میں تھا بکھیڑا پاک
ہوش کیا پائے گا پتہ میرا — لے اڑا دور جوہرِ ادراک

حسن اپنا بھی دیکھ لوں اک دن
عشق چاہے تو کردے خاک سے پاک

کیا چل سکے گی بادِ مخالف مزار میں — جلتا ہے دل جلوں کا چراغ اس دیار میں
الٹی ہوا زمانے میں چلتی ہے آج کل — فرق آگیا ہے گردشِ لیل و نہار میں
یوسف کو لے اڑے نہ کہیں بوئے پیرہن — اخفائے حسن و عشق نہیں اختیار میں
منزل کی دھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے — شورِ جرس سے دل نہ رہا اختیار میں
کہتے ہو اپنے فعل کا مختار ہے بشر — اپنی تو موت تک نہ ہوئی اختیار میں
کس کل پہ ہے یہ خاک کا پتلا بنا ہوا — کیا جانے کیا طلسم ہے مشتِ غبار میں
لیلیٰ کجا، کجا یہ طلسماتِ عنصری — کیا ڈھونڈتا ہے پردۂ گرد و غبار میں

دنیا سے یاس جانے کو جی چاہتا نہیں
واللہ کیا کشش ہے اس اجڑے دیار میں

گوشہ گیری ہے اک انوکھا سانگ — مانگتا ہے کھلے خزانے مانگ
پوچھنا کیا زمانہ سازوں کا — نت نیا بھیس، نت نرالا سانگ
شیخ کی کون سی ہے کل سیدھی — ارے جو بات ہے سو اوٹ پٹانگ

کس طلب میں چلا ہے بے اٹکل | آنکھ والوں سے پہلے آنکھیں مانگ
صلح ٹھہری تو ہے برہمن سے | کہیں مذہب اڑا نہ دے کوئی ٹانگ
خواہ پیالہ ہو ، یا نوالہ ہو | بَن پڑے تو جھپٹ لے بھیک نہ مانگ

بول بالا رہے یگانہ کا
نام باجے جگت کے چاروں دانگ

حُسن وہ حُسن جس کا رُوپ ، نہ رنگ | نِت نیا رنگ ، نِت نرالا ڈھنگ
حُسن کیا ، حُسن کی تجلّی کیا | رنگ لایا ہے جلوۂ بے رنگ
اُس نگاہ رسا کو کیا کہیے | جس پہ ہو عرصۂ دو عالم تنگ
دیکھیے لے اڑا کہاں سے کہاں | نشۂ رنگ و بوئے رنگا رنگ
کام کیا فلسفی کا ، رندوں میں | کیوں ہو بیٹھے بٹھائے رنگ میں بھنگ
مُردہ دل کو ٹٹولنے والو | چھیڑتے کیا ہو سازِ بے آہنگ
کیا اب آگے نہیں کوئی منزل ؟ | کیا ہوئی دل کی وہ لگن ، وہ اُمنگ
وہی اُلجھے نہ اُلجھے خاروں سے | جس کا دل تنگ ، جس کی دُنیا تنگ
ہنستے ہنستے بنے تھے پریم بھگت | دل لگی بڑھتے بڑھتے لائی رنگ
سنگدل کو بنا دوں میں دیوتا | آپ کیا جانیں بندگی کے ڈھنگ
آہ کے ساتھ کھل نہ جائے بھرم | درد کتنا ہے دل میں ، کتنی اُمنگ

میرؔ کے آگے زور کچھ نہ چلا
تھے بڑے میرزا یگانہ دبنگ

جان پیاری ہے، حیاتِ جاوداں پیاری نہیں
زندگی کیا، موت کی جب گرم بازاری نہیں

صبر کہتا ہے کہ رفتہ رفتہ مٹ جائے گا داغ
دل یہ کہتا ہے کہ بجھنے کی یہ چنگاری نہیں

جلوہ گر رہنے لگا چشمِ تصوّر میں کوئی
حضرتِ دل بے سبب راتوں کی بیداری نہیں

دیکھتے ہی دیکھتے بدلا زمانے کا یہ رنگ
پھولوں میں خوشبو، حسینوں میں وفاداری نہیں

چھوڑ کر جائیں کہاں اب اپنے ویرانے کو ہم
کون سی جا ہے، جہاں حکمِ خزاں جاری نہیں

جھیل لیں گے ہجر کے مارے قیامت کا بھی دن
آج کی شب تو کٹے پھر کوئی دشواری نہیں

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

دیوار پھاند پھاند کے دیوانے چل بسے
خاک اڑ رہی ہے چار طرف قید خانے میں

رہ رہ کے جیسے کان میں کہتا ہے یہ کوئی
ہوں گے قفس میں کل جو ہیں آج آشیانے میں

افسردہ خاطروں کی خزاں کیا، بہار کیا
کنجِ قفس میں مر رہے، یا آشیانے میں

ہم ایسے بدنصیب کہ اب تک نہ مر گئے
آنکھوں کے آگے آگ لگی آشیانے میں

دیوانے بن کے ان کے گلے سے لپٹ بھی جاؤ
کام اپنا کر لو یاسؔ بہانے بہانے میں

دل لگانے کی جگہ عالمِ ایجاد نہیں
خواب آنکھوں نے بہت دیکھے مگر یاد نہیں

توبہ بھی بھول گئے عشق میں وہ مار پڑی
ایسے اوسان گئے ہیں کہ خدا یاد نہیں

تلملانے کا مزہ کچھ نہ تڑپنے کا مزہ
ہیچ ہے دل میں اگر دردِ خداداد نہیں

سرِ شوریدہ سلامت ہے، مگر کیا کہیے
دستِ فرہاد نہیں، تیشۂ فرہاد نہیں

دشمن و دوست سے آباد ہیں دونوں پہلو
دل سلامت ہے تو گھر عشق کا برباد نہیں

کیا عجب ہے کہ دلِ دوست ہو مدفن اپنا
کشتۂ ناز ہوں میں کشتۂ بیداد نہیں

نکہتِ گل کی ہے رفتار ہوا کی پابند
رُوح قالب سے نکلنے پہ بھی آزاد نہیں

فکرِ امروز، نہ اندیشۂ فردا کی خلش
زندگی اس کی جسے موت کا دن یاد نہیں

خدا کی مار وہ ایامِ شورو شر گزرے
وہ جن شور تھا سر پر کہ سر سے در گزرے

حلال بھی مرے حق میں حرام، واویلا
نگاہِ شوق سے کیا کیا گل و ثمر گزرے

جو سبز باغِ تمنا پہ پھیر دے پانی
خدا بچائے ہم ایسی نظر سے درگزرے

نکالے عیب میں سو حُسن، حُسن میں سو عیب
خیال ہی تو ہے جیسے بندھے، جدھر گزرے

زمین پاؤں تلے سے نکل گئی تو کیا
ہم اپنی دُھن میں زمانے سے بے خبر گزرے

خدا کے بعد بھروسا ہے حضرتِ دل کا
خدانخواستہ شک ایسے دوست پر گزرے
مزا نہ پوچھیے واللہ دل دکھانے کا
کہاں کا خوفِ خدا، ٹھان لی تو کر گزرے
ادب کے واسطے کتنوں کے دل دکھائے ہیں
یگانہؔ حد سے گزرنا نہ تھا، مگر گزرے

مستانہ رقص کیجیے گردابِ حال میں
بیڑا ہے پار ڈوب کر اپنے خیال میں
مارِ فریبِ حُسن کا، پانی تو جائیے
کتنے خدا رسیدہ پڑے اس وبال میں
ہاں کیوں نہ پار اُتر چلوں خمیازہ جھیل کر
ڈوبے مری بلا عرقِ انفعال میں
ترسی ہوئی نگاہوں پہ اب رحم کیجیے
کب تک یہ امتیاز حرام و حلال میں
کیا زندگی کے بعد بھی ہے کوئی زندگی
پھر جان آ چلی چمنِ پائمال میں
واللہ قفس میں آتے ہی کایا مت پلٹ گئی
آخر ہمیں تو ہیں کہ پھڑکتے تھے جال میں
ہوش و خرد، حقیقتِ روشن کہیں جسے
ہے اک جھلک سی پردۂ صد احتمال میں
واللہ نگاہِ شوق کی معراج ہے یہی
وہ خواب دیکھیے جو نہ آئے خیال میں
حُسن کی آرزو میں ہوئے کتنے نامراد
اچھی گزر گئی مری فکرِ محال میں
کیا بزمِ اتحاد ہے، کیا حُسنِ اتفاق
بیگانہ و یگانہؔ ہیں سب ایک حال میں

موت آئی، آنے دیجیے پروا نہ کیجیے
منزل ہے ختم سجدۂ شکرانہ کیجیے
ناآشنائے حُسن کو کیا اعتبارِ عشق
اندھوں کے آگے بیٹھ کے رویا نہ کیجیے
تہ کی خبر بھی لائیے ساحل کے شوق میں
کوشش بقدرِ ہمتِ مردانہ کیجیے
دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجیے

دکھائی آج ہی آنکھوں نے صورتِ فردا
خزاں کی سیر بھی ہنگامۂ بہار میں ہے

غبار بن کے پلٹتی ہے، دامنِ دل میں
مٹے پہ بھی وہی دل بستگی بہار میں ہے

ہنوز گوش بر آوازِ غیب ہے کوئی
امیدوارِ ازل اب تک انتظار میں ہے

دوا میں اور دعا میں تو اب اثر معلوم
بس اک امیدِ اثر ضبطِ ناگوار میں ہے

قسم ہے وعدۂ صبر آزمائے جاناں کی
کہ لذتِ ابدی ہے تو انتظار میں ہے

آ رہی ہے یہ صدا کان میں ویرانوں سے
کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے

لے چلی وحشتِ دل کھینچ کے صحرا کی طرف
ٹھنڈی ٹھنڈی جو ہوا آئی بیابانوں سے

پاؤں پکڑے نہ کہیں کوچۂ جاناں کی زمیں
خاک اڑاتا جو نکل آوں بیابانوں سے

تنگئ چین جا کے کسی کوچے میں او دستِ جنوں
کیوں الجھتا ہے عبث چاک گریبانوں سے

آج ہی کل میں ہے چلنے کو نسیم وحشت
تنگ آنے لگے دیوانے گریبانوں سے

نہیں معلوم ان آنکھوں کا اشارہ کیا تھا
جنگ پر تل گئے کفار مسلمانوں سے

آنکھ اٹھا کر نہ کسی سمت قفس سے دیکھا
موسمِ گل کی خبر سنتے رہے کانوں سے

چلتے چلتے تو گلے شمع سے مل لیں اٹھ کر
اب سحر ہوتی ہے کہہ دے کوئی پروانوں سے

کیا کوئی پونچھنے والا بھی اب اپنا نہ رہا
دردِ دل رونے لگے یاسؔ جو بیگانوں سے

نگاہِ شوق ہوتی یا نگاہِ واپسیں ہوتی
بہر صورت زبانِ گنگ معنی آفریں ہوتی

نگاہِ مضطرب کی حد ہے فانوسِ خیالی تک
قیامت تھی اگر پروانۂ شمعِ یقیں ہوتی

فقط دل کی بدولت گرم ہے پہلوئے جاں ورنہ
جسد میں رُوح اک دیوانۂ تنہا نشیں ہوتی

خزاں سے پہلے ہی کاش اپنی آنکھیں بند ہو جاتیں
بہارِ اولیں ہوتی، نگاہِ واپسیں ہوتی

جو رو سکتے تو آنسو پونچھنے والے بھی مل جاتے
شریکِ رنج و غم دامن سے پہلے آستیں ہوتی

دمِ آخر فریبِ جلوۂ بے رنگ نے مارا
نگاہِ یاسؔ ورنہ کیوں گنہگارِ یقیں ہوتی

دل عجب جلوۂ امید دکھاتا ہے مجھے
شام سے یاسؔ سویرا نظر آتا ہے مجھے

دل کو لہراتا ہے ہنگامۂ زندانِ بلا
شورِ ایذا طلبی وجد میں لاتا ہے مجھے

پائے آزاد ہے زنداں کے چلن سے باہر
بیڑیاں کیوں کوئی دیوانہ پہناتا ہے مجھے

دیدنی ہے چمن آرائیٔ چشمِ عبرت
سیرِ تازہ گلِ پژمردہ دکھاتا ہے مجھے

لبِ دریا کا ہوا ہیں، نہ تہِ دریا کا
کون سے گھاٹ پہ دھارا لیے جاتا ہے مجھے

جلوۂ دار و رسن اپنے نصیبوں میں کہاں
کون دنیا کی نگاہوں چڑھاتا ہے مجھے

ننگِ محفل مرا زندہ، مرا مردہ بھاری
کون اٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے

یاسؔ منزل ہے مری منزلِ عنقائے کمال
لکھنؤ میں کوئی کیوں ڈھونڈنے آتا ہے مجھے

نہ انتقام کی عادت، نہ دل دُکھانے کی
بدی بھی کر نہیں آئی مجھے، کہ جانے کی؟
دہائی ہے دلِ دردآشنا دہائی ہے
کہ آہِ سرد پہ تہمت ہے دل دُکھانے کی
سمجھ میں آئی نہ زندانِ شش جہت کی کشش
کہ پاؤں رکھنے کی جا ہے، نہ بھاگ جانے کی
ہوا کے ساتھ پھرے چار سمت آوارہ
قدم اٹھائے جو رفتار پر زمانے کی
ہر ایک ذرّے سے آتی ہے بوئے زندہ دلی
نہ جانے خاک ہے اپنی کس آستانے کی
پلٹ کے گل میں نہ آئے گی بوئے مستانہ
نکل کے روحِ رواں منھ نہیں دکھانے کی
اب اپنے ختمِ سفر میں کچھ ایسی دیر نہیں
جو دیر ہے تو فقط تھک کے بیٹھ جانے کی
ہوس ہے سلسلہ جنبانِ سعیِ لاحاصل
بھری ہے سر میں ہوا قسمت آزمانے کی

جب تک خلشِ دردِ خداداد رہے گی
دُنیا دلِ ناشاد کی آباد رہے گی
دنیا کی ہوا راس نہ آئے گی کسی کو
ہر سر میں ہوائے عدم آباد رہے گی
چونکائے گی رہ رہ کے تو غفلت کا مزہ کیا
ساتھ اپنے اجل صورت ہمزاد رہے گی
دل اور دھڑکتا ہے ادب گاہِ قفس میں
شاید یہ زباں تشنۂ فریاد رہے گی
شیطان کا شیطان، فرشتہ کا فرشتہ
انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی
جو خاک کا پتلا، وہی صحرا کا بگولا
مٹنے پہ بھی اک ہستیِ برباد رہے گی
ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش
دُنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
شہرہ ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا
واللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

زمانے پر نہ سہی، دل پہ اختیار رہے
دکھا وہ زور کہ دُنیا میں یادگار رہے

کہاں تلک دلِ غمناک پردہ دار رہے
زبانِ حال پہ جب کچھ نہ اختیار رہے

نظامِ دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں
مگر ہم ایک ہی پہلو سے بیقرار رہے

ہنسی میں لغزشِ مستانہ اڑ گئی واللہ
تو بے گناہوں سے اچھے گناہگار رہے

زمانہ اس کے سوا اور کیا وفا کرتا
چمن اُجڑ گیا، کانٹے گلے کے ہار رہے

خزاں کے دم سے مِٹا خوب و زشت کا جھگڑا
چلو یہ خوب ہوا، گل رہے نہ خار رہے

یگانہؔ حال تو دیکھو زمانہ سازوں کا
ہوا میں جیسے بگولہ خراب و خوار رہے
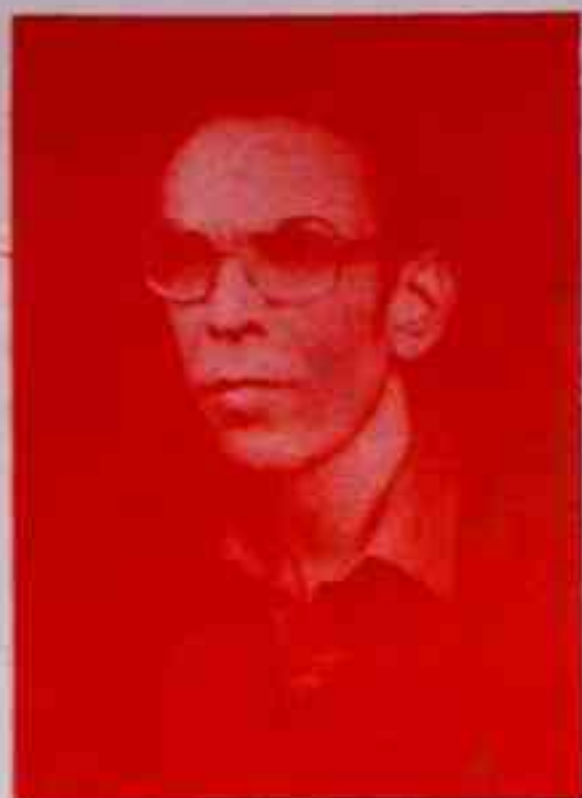
نام: نیر مسعود

ولادت: لکھنؤ ۱۶ نومبر ۱۹۳۶ء

۱۹۵۷ء میں فارسی میں ایم اے کرنے کے بعد اردو اور فارسی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۶۵ء میں کچھ دن فضل الرحمن اسلامیہ انٹر کالج بریلی میں اردو اور فارسی پڑھاتے کے بعد اسی سال لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی کے استاد مقرر کیے گئے اور اب بھی یہی روزگار کی صورت ہے۔ ۱۹۶۵ء ہی سے باقاعدہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ ادبی تربیت والد مرحوم پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے زیرسایہ ہوئی۔ لکھنے لکھانے کا شوق زیادہ تر مشہور نقاد شمس الرحمن فاروقی کی تحریک کا نتیجہ ہے۔ انیس ۱۹ کتابیں (تصنیف، ترتیب، ترجمہ) شایع ہو چکی ہیں جن میں "رجب علی بیگ سرور" (۱۹۶۷ء) "تعبیر غالب" (۱۹۷۳ء) "مرثیہ خوانی کا فن" (۱۹۹۰ء) "دیوان فارسی میر تقی میر" (۱۹۸۳ء) "کافکا کے افسانے" (۱۹۷۸ء) "سوتا جاگتا (بچوں کے لیے ۱۹۸۵) اور افسانوں کے دو مجموعے "سیمیا" (۱۹۸۴ء) اور "عطر کافور" (۱۹۹۰ء) شامل ہیں۔ میر انیس کی سوانح عمری زیر تصنیف ہے۔ رسالوں میں شایع ہونے والی تحریروں کی تعداد ۱۶۰ کے قریب ہے۔

۱۹۷۱ء میں شادی ہوئی۔ چار بچے (ایک بیٹا، تین بیٹیاں) ہیں

ISBN 81-7160-031-X